کالے کنویں

اجیت کور

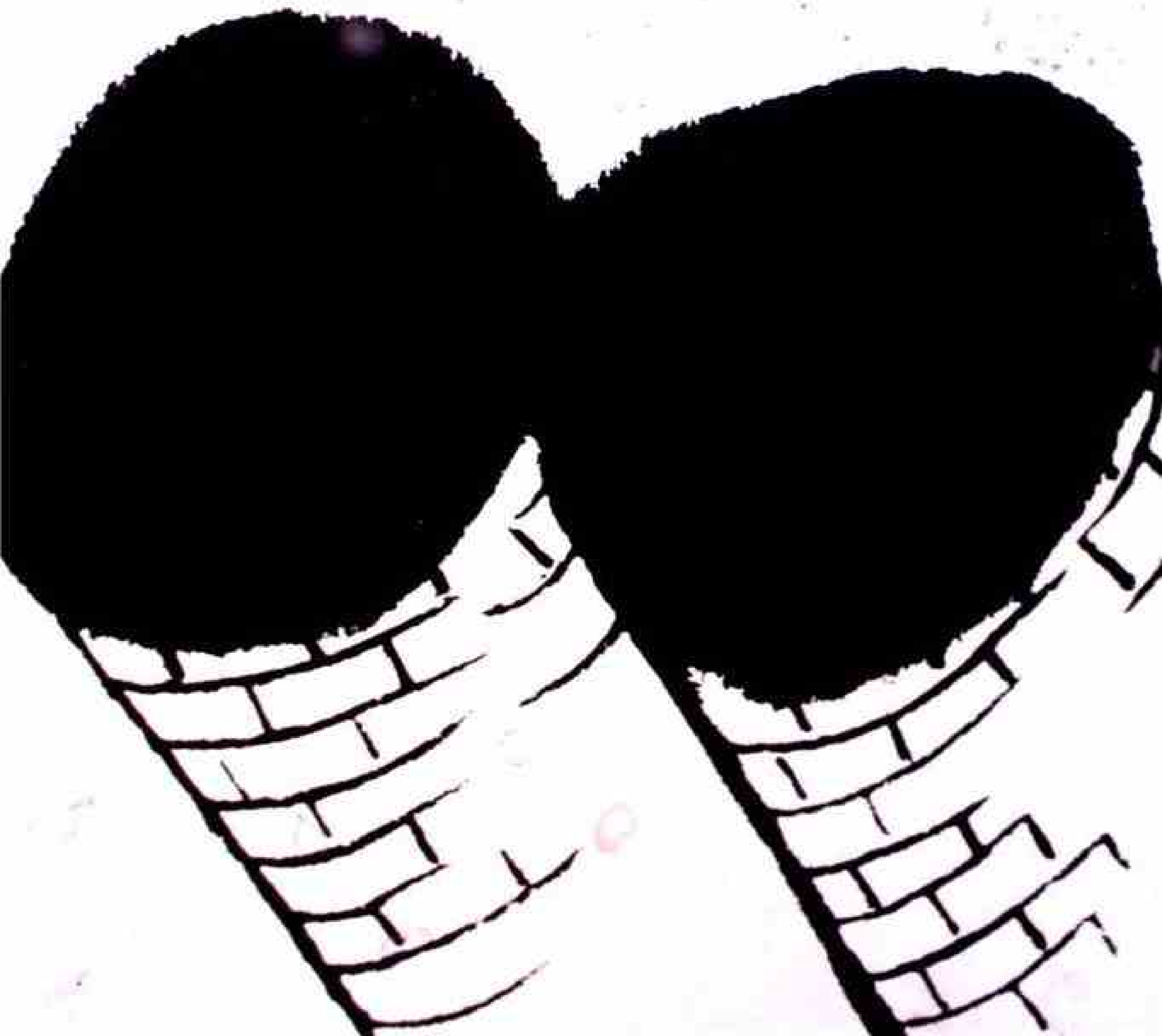

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

کالے کنویں

اجیت کور

Modern Publishing House,
9, Gola Market, Darya Ganj,
New Delhi - 110002.
Phone : 011-3278869

KALE KUYEN (Short Stories)
By:- Ajeet Cour

Rs. 150/- **2001**

HaSnain Sialvi

کالے کنوئیں

(افسانے)

مصنفہ

اجیت کور

ترجمہ

خالد محمود

ناشر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ - گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

فون: 011-3278869

© اجیت کور
اکادمی آف فائن آرٹ اینڈ لٹریچر
4/6، سری فورٹ انسٹی ٹیوشنل ایریا،
نئی دہلی

اشاعت	:	۲۰۰۱ء
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق	:	وجے گرافکس، نئی دہلی
مطبع	:	ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

زیرِ اہتمام
پریم گوپال مِتّل

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ - گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

HaSnain Sialvi

اندرونِ صفحات

- موت علی بابا کی ۷
- نہ مارو ۱۸
- سورج چڑیاں اور رب ۲۹
- کالے کنویں ۳۵
- آگ کے پھول ۳۹
- بازی گرنی ۷۱
- سناٹے کی چیخ ۹۵
- شہر یا گھونگا ۱۲۲
- چوراسی کا نومبر ۱۴۶

HaSnain Sialvi

موت علی بابا کی

آخر ایک دن اس آدمی نے جو آدمی کم اور کلرک زیادہ تھا اور جس کا نام رام لال تھا اپنے دفتر یعنی ٹاؤن ہال کی چوتھی منزل سے کود کر خودکشی کر لی۔

اگلے دن اخبار کی مقامی خبروں والے تیسرے صفحہ پر بالکل نیچے جہاں جرائم و حادثات کی خبریں چھپتی ہیں کہ شہر میں اتنے قتل کے واقعات ہوئے زنا بالجبر کے اتنے معاملات ہوئے، فلاں شخص ٹرک کے نیچے چل گیا، ایک بچہ ریلوے لائن پر کٹ کر مر گیا، فلاں شخص نے خودکشی کر لی، فلاں فلاں اور فلاں عورتیں اسٹوو پر چائے بناتے ہوئے جل کر مر گئیں، وہیں کوئی دو ایک سطروں کی خبر شائع ہوئی کہ رام لال جو میونسپلٹی میں کلرک تھا ٹاؤن ہال کی چوتھی منزل سے کود کر مر گیا ہے۔

اس دن تیسرے پہر مسز ڈھا کی کٹی پارٹی میں مسز ماتھر نے جو باقی سب عورتوں سے ہلکے میل کی ساڑیاں اور گہنے پہننے کے لیے مجبور تھی کیونکہ اس کے گھر والے کو کمبخت بھارت سرکار نے پچھلے چھ سالوں سے وزارت دفاع کے ایک ایسے دقیانوسی محکمے میں پھنسا رکھا تھا جہاں بالائی آمدنی کے کوئی مواقع نہیں تھے اور اسی وجہ سے مسز ماتھر کو اپنی ساڑیوں اور گہنوں کے ہلکے پن کو چھپانے کے لیے کٹی پارٹی کے دن ایک طرف بیٹھ کر اخبار پڑھنے کے لیے اور اس کی دو تین عنوانوں والی خبریں یاد کر کے پارٹی میں ان کے بارے میں بات کر کے دوسری عورتوں پر اپنے بیدار مغز ہونے کا رعب جمانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑتی تھی۔ چکن تکے کے ٹکڑے کو نزاکت سے کترتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کون تھا بیچارہ وہ رام لام جو کل ٹاؤن ہال سے کود کر مر گیا ہے۔

جواب میں کچھ پلکیں جھپکیں، کانوں کے ہیرے جھلملائے اور مسز ڈھا کیونکہ میزبان تھیں بولیں غریب بے چارہ۔

اس دوپہر کو پریس کلب میں بیئر کے جھاگ جھاگ ہوئے گلاسوں کو پرانی نامرادی

میزوں پر رکھ کر اخباری لوگ تارا پور پلانٹ اور بھاری پانی (آبِ ثقیل) کے مسئلہ پر بات کر رہے تھے۔ گپتا جو ہر روز ہندی میں دو صفحوں کا ایک شام نامہ شائع کرتا تھا اور اسی لیے دو سال پہلے جسے اندرا گاندھی نے راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا تھا، بولا۔ ''اس رام لال کے بارے میں کچھ پتہ لگاؤ۔''

''رام لال اپنی تگڑم میں لڑ رہا ہے۔ ہر وزیر اعلیٰ جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جاتا ہے تو آنے والے کے خلاف بدعنوانی کے ثبوت جمع کرنے لگتا ہے۔ پرسوں ملا تھا نئے وزیر اعلیٰ کے بارے میں معلومات دینے گے لیے۔'' ہندوستان ٹائمز کا راج بولا۔

''ارے بھائی وہ رام لال نہیں۔ وہ رام لال جس نے کل ٹاؤن ہال سے کود کر خودکشی کر لی ہے وہ رام لال۔''

''اس کی تو کرائم رپورٹر تحقیقات کر رہا ہے، شاید آج رات اس کی اسٹوری فائل کرے گا۔''

''لیکن کہانیاں تو کل رات سے ہی سب کی جیبوں میں تھیں، پون منچندا نے جو سب کی مدد کی تھی اصلیت جانتے ہی وہ آج فائل کی جائے گی، کل سب اخباروں میں شائع ہوگی۔''

دفتر کے پی آر او یعنی افسر رابطہ عامہ پون منچندا نے کل شام ایک خصوصی پارٹی دی تھی۔ پریس والوں کو تاج میں — اس طرح کا قابل نفرت خون خرابہ موت ووت کسی بھی دفتر کے لیے بڑی شرم اور بدنامی کی بات تھی اور پون منچندا کا تو کام ہی یہی تھا کہ ہر بدنامی کو نیک نامی میں بدل دے۔ چھومنتر سے جے کالی کلکتہ والی تیرا جادو نہ جاوے خالی۔

سو رام لال کی خودکشی کی خبر لاکھ دبانے پر بھی جب نہ دبی تو پون منچندا کو میونسپل کمشنر نے طلب کیا ''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟ ویسے کون تھا یہ رام لال؟ تمھارے رہتے ہوئے کمبخت پریس والوں کو اس کی خبر کیسے ہوگئی، چھ ٹیلی فون آ چکے ہیں۔''

پون منچندا نے اپنے چکنے چہرے پر ایک چکنی مکھنی مسکراہٹ نمودار کی۔ ''سر اس کی نعش جب کھلے عام نیچے صحن میں آ کر گری تو کیسے خرد برد کر دیتا میں؟''

''وہ میں کچھ نہیں جانتا لیکن نعش نہیں تو کم سے کم خبر تو خرد برد کی ہی جا سکتی تھی۔'' میونسپل کمشنر صاحب کے تیوروں اور تیوریوں کو آج کوئی مکھن جیسی مسکراہٹ دور نہیں کر سکتی تھی۔

خیر دونوں کا ایک بات پر ضرور اتفاق رائے تھا کہ یہ حرامی خبروں والے بڑے نمک حرام اور شراب حرام ہوتے ہیں۔ ذرا لحاظ نہیں ہے انھیں، پون منچندا نے سب سے پہلے رام لال کی خودکشی کا ذمہ اس کے اپنے ہی گھر والوں پر ڈالنے کی کوشش کی، ارے بھئی کچھ بھی ہو سکتا ہے،

رام لال کی بیوی کسی اور کے ساتھ پھنسی ہوئی ہو سکتی ہے، رام لال کی کنواری بیٹی حاملہ ہو سکتی ہے، رام لال کا بیٹا کسی ڈاکہ میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ نہیں؟

لیکن ساری کھوج خبر کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، پھٹی دھوتی پہننے والی، اور ۳۵ سال کی عمر میں ۵۰ سال کی نظر آنے والی رام لال کی بیوی کسی کے ساتھ کیا گرفتارِ عشق ہوگی، رام لال کی بیٹی ابھی ساڑھے چھ سال کی تھی اس لیے وہ نہ حاملہ ہو سکتی تھی اور نہ کسی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی، رام لال کے دو بیٹے ابھی چھٹی اور ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے ڈاکہ نہیں ڈال سکتے تھے اور پھر جناب یہ مفلسوں کے بچے کیا کھا کر ڈاکہ ڈالیں گے؟ اس پر تو بڑے بڑے رئیسوں کے یعنی وزیروں کے بیٹوں کا ہی موروثی حق ہے۔

لیکن اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا، پون منچندا کو تو تنخواہ ہی اسی بات کی ملتی تھی سو سارے دفتر میں اوپر سے نیچے تک اور پھر نیچے سے اوپر تک ایک کاغذ چلایا گیا باقاعدہ فائلوں میں منسلک کیا ہوا۔ پرانی تاریخوں میں شکایت کسی بھاردواج کی (جلدی میں یہی نام سوجھا پون منچندا کو کیونکہ آجکل کسی بھاردواج کی لڑکی سے اس کی شادی کی بات چل رہی تھی) رام لال نے پراپرٹی ٹیکس میں ہیر پھیر کرنے کے لیے ان سے چار سو روپے رشوت مانگی ہے، اور پھر پورا کیس تیار ہوا۔ رشوت لیتے ہوئے رام لال کا رنگے ہاتھ پکڑا جانا (کیونکہ صاحبان، رنگے ہاتھ صرف کلرک چپراسی ہی پکڑے جاتے ہیں، اور چھوٹے موٹے افسر جن کی اوپر والوں سے نہ بنتی ہو، اس ملک کی گذشتہ انتالیس برسوں کی تاریخ گواہ ہے) چارج شیٹ معطلی کا حکم جو ابھی دستخط ہونے کے لیے کسی کونسلر کی میز پر ہی پڑے تھے اب معطلی کے احکام دفتر میں چہل قدمی کر رہے ہوں تو کچھ بھنک پڑ ہی جاتی ہے آدمی کو، سو رام لال کے کانوں میں بھی ان کی بھنک پڑ گئی۔ بدنامی کے خوف سے رام لال نے خودکشی کر لی، پوری کہانی ہندی فلموں کے رائٹر جس طرح گڑھتے ہیں اسی طرح۔

تیسرے پہر تک ساری کارروائی درست کر کے پون منچندا نے جا کر رپورٹ دی میونسپل کمشنر صاحب کو اور اس طرح رام لال کی نعش کے گلے میں جو ابھی پوسٹ مارٹم کی میز پر ڈاکٹروں کی چھریوں چاقوؤں کے نیچے تراشی جا رہی تھی، بے ایمانی کا پٹہ ڈال دیا گیا اور نعش کے پیٹ میں پہلی کئی رشوتوں کے نوٹ جو پکڑے نہیں گئے تھے اور جنھیں رام لال خاموشی سے کسی سبز چراگاہ میں آنکھیں آدھی میچے چرتا رہا تھا بقول پون منچندا کی فائلوں کے برآمد کر کے بھوسے کی طرح پیٹ کے بورے میں بھر کر نعش کو سی دیا گیا۔ پوسٹ مارٹم کے کمرے کے باہر رام لال کی پھٹے حال بیوی اور تین گھبرائے ہوئے بچے حیران بیٹھے تھے، کھوئے ہوئے سے

لٹے ہوئے سے اور دو چار بوڑھے کھوسٹ اڑوسی پڑوسی، گلی کی دو چار عورتیں، دو چار رشتہ دار آندھی میں اُڑ کر آئے ہوئے سوکھے لاوارث تنکوں کی ایک چھوٹی سی بدحواس ڈھیری کی طرح۔ ظاہر ہے کہ رام لال کے اڑوسی پڑوسی اور اس کے رشتہ دار اسی کی طرح درجہ سوم اور درجہ چہارم کے افسر ہی رہے ہوں گے یا چھوٹی قرولباغی دُکانوں کے سیلز مین پھیری والے چھوٹے موٹے دھندے کرنے والے لوگ۔ یہ لوگ آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ انھیں یہی فکر لگی رہتی ہے کہ اگر دہاڑی ٹوٹ گئی تو رات کو چولھا نہیں جلے گا، نوکری پیشہ لوگ اپنی رخصت اتفاقیہ (سی ایل) کے گننے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو لاش ہونے سے بچاتے بچاتے یہ دوسروں کی لاشوں کے لیے بڑے بے مروّت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے رام لال کی اگر رات تک آخری رسوم ادا نہ کی گئی ہوں تو یہ رات کو لاش کے پاس بیٹھ کر اپنا پڑوسی ہونے کا فرض ادا کریں گے اور اگر ہو گیا تو اس کی بیوی کو تسلی دے آئیں گے اور کوئی کر بھی کیا سکتا ہے؟

اس دن جب شام ڈھلنے لگی اور رام لال کی لاش شمشان گھاٹ پہنچی تو پون منچندا تاج کے ایک سویٹ میں اخباری لوگوں کو اسکاچ پلا رہا تھا۔ ویسے اخباری لوگوں کو اسکاچ ہمیشہ نہیں پلائی جاتی تھی صرف تب جب کوئی بہت بڑا اسکینڈل ہو جائے اور اس اسکینڈل کی سیاہی کے داغ پر کوئی تیز چیز ڈال کر اس داغ کی سیاہی کو پگھلانا ہو، کالی رنگت کو ہلکا کرنا ہو تب پون منچندا کے "صاحب لوگ" اسکاچ اور تاج سینکشن کر دیتے تھے۔ اس طریقہ کار کو اسکینڈل کی خبر کے شائع ہونے کی خصوصی زبان میں "واٹر ڈاؤن" کہا جاتا ہے۔ اسکینڈل کا بھی اور اسکینڈل کی خبر کا بھی اور پون منچندا کی یہ خصوصیت تھی اور اس کی اعلیٰ ترین خوبی بھی۔

اور اسی خصوصیت کی بدولت پون منچندا اس پی آر او کے عہدے پر فائز تھا، اخباروں کے بڑے بڑے تیس مار خانوں سے ملتا تھا، ان سے دوستی رکھتا تھا۔ ویسے اس قسم کی دوستی میں کوئی دھاندلی نہیں ہوتی، دونوں فریق جانتے ہیں کہ انھیں بیوقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دونوں ہی فریق اپنے آپ کو نہیں صرف دوسروں کو ہی بیوقوف بنا ہوا سمجھتے ہیں۔ اخبار والے اپنے دل میں یہ سوچ کر ہنسے جاتے ہیں کہ پی آر او طوائف کا پیشہ کر رہا ہے اور پی آر او اپنے دل میں یہی سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ یہ ہزار دو ہزار تنخواہ لینے والے سالے رپورٹر اپنی جیب سے تو ٹھرا بھی نہیں پی سکتے اور اب اسکاچ پی کر اپنے قلم کی طوائفی پر عیش کر رہے ہیں، لیکن رنڈی کو رنڈی کون کہے گا جی؟ پس دونوں فریق ایک دوسرے کی طوائفی کی عزت کی پردہ داری رکھے جاتے ہیں کیونکہ یہی دستور ہے اخلاقیات کا اور سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اور ہر پی آر او جانتا ہے کہ سالے اخبار والے مفت کی شراب اتنی پی لیں گے اور مفت کے کباب اتنے کھالیں گے کہ لوٹ کر دفتر جانے لائق نہیں رہیں گے۔ گھر جا کر لڑھک جائیں گے اور آدھی رات کو جب شراب کی جھونک بے ہوشی سے ادھر ذرا رہ جائے گی نشہ ابھی اتنا نہیں اترا ہوگا کہ اپنی بیوی کے جسم سے پیاز کی اور مسالوں کی اور پسینے کی بو سونگھ سکیں تو اسے ہیما مالنی یا پدمنی کولہا پوری سمجھ کر اس کے ساتھ ہم بستری کریں گے تب بیچاری خبر کا کیا بنے گا؟

لیکن کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کا حل نہ ہو سو خبر پر امبارگو (پابندی) لگا دیا جاتا ہے کہ یہ خبر کل سے پہلے پریس میں نہیں جائے گی اور سب رضامند ہو جاتے ہیں اور کہانیاں جیب میں ڈال کر گھر لے جاتے ہیں، اگلے دن نیوز ایڈیٹر کو پیش کرنے کے لیے، آخر ہر دھندے کا کوئی قاعدہ قانون ہوتا ہے اور تو اور کوٹھوں کے بھی اپنے آداب ہوتے ہیں، سو یون منچند انے بھی کہانی پر امبارگو لگا دیا۔ اس طرح رام لال کی نعش کو اپنی رشوت کی کہانی پتہ لگتے لگتے رہ گئی۔ رہی بات رُوح کی جو کہ آس پاس ہی بھٹکتی رہتی ہے کچھ دن تو رُوح ہوا ہوتی ہے اور ہوا کون سا ہوا ہوتی ہے جو کھا جائے گی تو رام لال کی خودکشی کے تیسرے دن اخباروں میں خبر چھپی کہ رام لال کلرک کو فرد الزامات دی گئی تھی اور معطلی کے احکام ہونے والے تھے اس لیے بدنامی کے ڈر سے اس نے خودکشی کر لی۔

ان دو دنوں میں رام لال کی بیوی کا کلیجہ ظاہر ہے ڈرتا رہا تھا، بچے لٹے لٹائے سے بیٹھے تھے اور پڑوسیوں کا لایا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سب اونچے طبقے کے لوگوں میں نہیں ہوتا، موت والے گھر میں سناٹا تو ہوتا ہے لیکن باورچی خانہ میں چولھا ٹھنڈا نہیں ہوتا کیونکہ نوکروں کو، آیا کو، ڈرائیوروں کو تو چائے بھی چاہئے ہوتی ہے اور کھانا بھی کھانا ہوتا ہے اس لیے چائے کی کیتلی بھی اُبلتی رہتی ہے، کھانا بھی پکتا رہتا ہے اور بڑے لوگوں کا غم کیونکہ شائستہ ہوتا ہے اس لیے افسوس کرنے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کو بھی چائے پلائی جاتی ہے، اور گھر کے نوکر ہی منتیں کر کے زندہ بچے لوگوں کو کھلا پلا دیتے ہیں۔ بہت چھوٹے نیچے طبقوں میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ وہاں ویسے ہی چولھا عام طور پر ٹھنڈا ہی رہتا ہے اور گھر میں سال میں تین سو پینسٹھ دن غم ہی چھایا رہتا ہے اور ماتم رہتا ہے لیکن یہ متوسط طبقہ جو ڈھکی ہوئی ہنڈیا کی تلی جو عام طور پر یا تو دھوئیں سے بھری رہتی ہے یا کھرچ کھرچ کر صاف ہوتی رہتی ہے، اس تلی میں بسنے والے دھوئیں سے اور کھرچے ہوئے لوگوں کو غمی کے موقع پر پڑوسی کھانا کھلاتے ہیں۔

تیسرے دن جب اخبار میں رام لال کا کچا چٹھا چھپا تو ظاہر ہے کہ رام لال کی بیوی کو صبح کے وقت اس کی کوئی خبر نہیں لگی کیونکہ جن گھروں میں روٹی ہی پوری نہیں ہوتی وہاں اخبار جیسی

فضول خرچی نہیں کی جاتی۔

یہ لوگ صرف وہی خبریں سنتے ہیں جن کے پر لگے ہوں یعنی اُڑتی اُڑتی خبریں اور یہ اُڑتی اُڑتی خبریں صرف محلّہ کی لڑکیوں اور لڑکوں کی ہوتی ہیں، بگڑے ہوئے شوہروں اور منہ جھلسی ساسوں کی ہوتی ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے بچے کھچے وقت کا تین چوتھائی حصہ پڑوسیوں کے گھروں میں رونما ہونے والے واقعات کی معلومات رکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ محلّہ سے باہر نکلیں تو شہر میں ڈکیتیوں کی اور خطرناک حادثوں کی خبریں ہی ہوتی ہیں۔ قومی سطح پر ایسی خبریں کہ اندرا اپنے بیٹے کی موت پر روئیں نہیں، اندرا گاندھی نے مینکا کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے، راجیو گاندھی پہلے ہوائی جہاز اُڑاتا تھا اور اب ملک کی پتنگ اُڑا رہا ہے وغیرہ۔ ویسے سوچا جائے تو اور خبروں کا کیا اچار ڈالنا ہوتا ہے کسی کو، گورباچوف نے ریگن کو کیا تار بھیجا ہے، یوروپین اکنامک کمیٹی کی میٹنگ میں کیا فیصلے ہوئے ہیں، انکٹاڈ نے کیا گل کھلائے ہیں، نان الائنڈ کانفرنس کیا بلا ہے، امریکہ کون کون سے چھوٹے ملکوں کو یعنی چوزوں کو پنجوں کے نیچے دبا رہا ہے۔ اسپین میں لال سرکار بنی ہے یا کالی، کس ملک میں حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش ہو رہی ہے اور اسے کیسے دبایا جا رہا ہے، ان سب خبروں سے کسی کا کیا بنتا سنورتا ہے، ہے کہ نہیں۔

یوں تو آجکل کا زمانہ اخباری کلچر کا زمانہ ہے لیکن رام لال کی بیوی اس نگوڑی نئے فیشن کی تہذیب سے کوری تھی اسی وجہ سے ہی غریبی ہی میں مطمئن تھی۔ ہر روز صبح اُٹھ کر اور رات کو سوتے وقت بھگوان کی مورتی کے آگے ماتھا ٹیکتی تھی، بھلے ہی پھول بھی مہنگے ہیں اور اگربتیاں بھی پھر بھی ان ہی خصوصی دنوں پر یعنی شوراتری اور کرشن جنم اشٹمی کے دن رام لال جب سویرے دودھ لینے جاتا تو پارک سے دو چار گرے ہوئے پھول اٹھالاتا تھا اور اگربتی جلا کر بھگوان کا پیٹ بڑھ تھڑے منالیا کرتا تھا۔ مزے کروادیے جاتے تھے بھگوان کے لیکن رام لال کی خودکشی کی اندرونی خبر دوسرے لوگوں کے لیے اسی قسم کی مرچ مسالہ دار خبر تھی جیسی خبریں اس طبقہ کے لوگوں کی منڈیروں پر اُڑتے اُڑتے آ ہی بیٹھتی ہیں۔ سو دوپہر ہوتے ہوتے یہ خبر رام لال کی بیوی کے کانوں میں بھی آ پڑی۔

''جھوٹ ہے یہ سراسر جھوٹ گھر میں تو بھنگ گھٹتی رہتی تھی، مشکل سے کھینچ تان کر کے میں مہینہ پار کرتی تھی رشوت لینے والے ہوتے اگر ہمارے بابوجی تو بچے اس طرح نہ ترستے آج۔ گھر میں چار چھلڑ ہوتے ان یتیموں کا بیڑا پار لگانے کے لیے'' وہ دو ہتڑ مار کر پیٹ رہی تھی، پیٹ پیٹ کر نیلی ہو رہی تھی۔ لیکن آدھی رات کو جب اسے اپنی پیٹھ کے نیچے سے فرش میں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی لگ رہی تھیں ایکا ایکی اسے خیال آیا یوں بابوجی تھے تو چپکے سے ہی

آدمی ہر وقت کھوئے کھوئے سے۔ میں تو یہی سوچتی تھی کہ کم تنخواہ میں گھر بار چلانے کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں، اگر ان کی بالائی آمدنی تھی اور اسے گھر نہیں لاتے تھے تو کون جانے کوئی اور میری سوتن ہی کہیں رکھی ہوئی ہو، ان مردوں کی ذات کا کیا بھروسہ۔

اور اس طرح صاحبان وہ آدمی جو صرف ایک چوتھائی آدمی تھا اور تین چوتھائی بیل تھا کیونکہ وہ کلرک کی جون میں پڑا ہوا تھا اور جس کا نام رام لال تھا اس کی چتا کے ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس کی ساکھ اس دُنیا سے بالکل مٹ چکی تھی۔ احمق آدمی ساری عمر یہی سمجھتا رہا کہ کیا ہوا اگر وہ بھوکا مر رہا ہے، کیا ہوا اگر اس کے جوتوں کے تلوں میں چھید ہیں، کیا ہوا اگر اس کے بچے پھٹے حال سرکاری اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں، اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمائی اس کی نیک نیتی اور ایمانداری ہے۔ ہاں بچوں کے پیٹ میں روٹی ہو یا نہ ہو وہ سر اُونچا اٹھا کر چل سکتے ہیں کہ وہ ایک ایماندار محنت کش باپ کے بچے ہیں۔

احمق آدمی ہر غریب آدمی کی طرح پیدائشی احمق، بھول گیا کہ غریبی اور بیوقوفی کی پرانے زمانے سے شراکت داری ہے اور غریب آدمی ایک ہی کام کر سکتا ہے یا تو اپنا حق چھین کر لے لے یا ٹھگ کر، اگر ان دونوں میں سے ایک کام بھی نہیں کر سکتا تو وہ خود ٹھگا جائے گا۔

اور رام لال کے ساتھ سب سے بڑی ٹھگی اس کی موت کے بعد ہوئی۔ ویسے ٹھگے جانے کا یہ احساس ہی تھا جس نے اس سے خودکشی کروائی، آپ پوچھیں گے جس بات کا اس کی بیوی کو اتنے برس اس کے ساتھ رہنے کے بعد بھی پتہ نہ لگا اس بات کا اس کے دفتر میں اس کے ساتھ برسوں سے کام کرنے والے اور دوپہر کو ایلمونیم کے ڈبے کھول کر بھنے ہوئے آلوؤں کی سوکھی ترکاری اور روٹی کھانے والے اور کٹڑک چائے پینے والے اس جیسے ہی کلاس تھری کے بابوؤں کو پتہ نہ لگا اس کی خبر مجھے کیسے ہوگئی؟ تو صاحبان یہ راز کی بات ہے یہی اپنا ٹریڈ سیکریٹ ہے۔ اگر آپ کو بتا دوں تو آپ سب افسانہ نگار بن جائیں گے اور اس خاکسار کی روزی روٹی کس طرح چلے گی۔

ہوا یہ کہ رام لال کا تبادلہ ہوا اور اسے پبلک ورکس کے میونسپل کونسلر کا پی اے بنایا گیا۔ پی اے سمجھتے ہو نہ یعنی پرسنل اسسٹنٹ بیل کو تو چارہ ہی کھانا ہوتا ہے چاہے وہ مالکوں کے کھونٹے سے بندھا رہے چاہے اسے چور لے جائیں۔ سو کلرک کو بھی کلرکی ہی کرنی ہوتی ہے چاہے اس سے فائلوں کی کارروائی کروائی جائے چاہے بلوں کی ادائیگی جمع کروائی جائے چاہے پی اے گیری کروائی جائے۔

رام لال کے ساتھیوں نے اسے مبارکباد دی۔ ''کس بات کی مبارک باد بھائی؟ بیل تو

ہل کے آگے جُتے گا یا کولھو میں یا رہٹ چلائے گا یا گڈا کھینچے گا کیا فرق پڑتا ہے۔''

''برخوردار فرق تو اس کرسی پر بیٹھ کر پتہ چلے گا، کروڑوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں اس صاحب کے کمرے میں۔ باہر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا کچھ چڑھاوا آپ کے حصہ میں بھی آئے گا ہی۔''

لیکن یہ سب باتیں رام لال کو گالیوں جیسی لگتی تھیں اور اسے اتنی شرم آتی تھی کہ قسمت نے یہ کہاں لا کر پھنسایا ہے اے بھگوان، خیر نوکری تو نوکری ہے، نوکری کر لی تو نخرہ کیا، بڑے بزرگ یوں ہی تو نہیں کہہ گئے ''پنچ چاکری۔''

دن بھر عجیب تماشے ہوتے، اسے کونسلر صاحب نے ایک لسٹ بنوادی تھی پہلے دن ہی کہ ان لوگوں کے فون آئیں یا وہ خود آجائیں تو فوری طور پر ہم سے ملا دیا جائے۔

باقی تو رام لال کو سب کچھ خود ہی سمجھنا تھا۔ دھیرے دھیرے تجربے سے سمجھنی تھی کونسلر صاحب کی آواز کی ترشی اور مٹھاس، کھنک اور ٹنکار، دم خم اور نرمی پلکوں کی جنبش اور آنکھوں میں جل اٹھنے والی قندیل یہ سب جنبشیں اور لرزش اور تیوران سب کا باریک سے باریک فرق سمجھنے سے ہی اس کی نوکری کا تعلق تھا، کسے فوراً ملا دینا ہے اور کسے ٹالنے والی افیم کھلاتے رہنا ہے، کسے ادب سے چائے پلانی ہے اور کسے دوٹوک جواب دے دینا ہے۔ یہ سب تو سرچ کر کے سمجھنے والی باتیں ہیں۔ یہ رام لال کو پتہ لگ گیا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو جدھر سے بھی دیکھتا اسے لگتا یہ سب اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کرسی پر بیٹھ کر وہ ایک عجیب وغریب دنیا میں داخل ہو گیا، اس کے آس پاس چالیس نہیں چالیس ہزار چور تھے اور وہ خود تھا علی بابا لیکن قصہ والا علی بابا تو چوروں سے مور ہو کر ٹکرایا تھا لیکن یہ علی بابا صرف حیران ہوتا تھا اور ان سب چوروں کو سارے کونسلروں سے ضرب دیتا تھا لیکن چور تو ستاروں سے آگے بسنے والے ہزاروں جہانوں کی طرح ہزاروں لاکھوں بار ور ضرب کیے جانے کے محتاج تھے۔ ایک ہزار سے زائد ممبرانِ پارلیمنٹ اور ان کے گرد جمع ہوئی چوروں کی بھیڑ، منسٹر اور ان کے گرد جمع ہوا چوروں کا جمگھٹ ریاستی حکومتیں اور چوروں کے اور گروہ چور در چور، اسے لگتا یہ سب مل کر اسے ہی لوٹ رہے تھے کیونکہ رام لال ہندوستان تھا پورا دیش تھا دیش بھر کے لوٹے جانے والوں کا وارث، دوسروں کے ہاتھوں لوٹے جانا اسے وراثت میں ملا تھا۔

اس کرسی پر بیٹھنے کے نتیجے میں اسے معجزاتی نظر مل گئی تھی، اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ لاکھوں مریض دوا کے بغیر کیسے مرتے ہیں، لاکھوں بچے اسکولوں کے بغیر کیسے اَن پڑھ رہ جاتے

ہیں، روزگار کے بغیر کس طرح نوجوان ہڈیوں میں گھن لگ جاتا ہے اور یہ کہ نئی نئی کولتار کی سڑکیں کس طرح پہلی ہی بارش میں خراب ہو جاتی ہیں، نئی بن رہی عمارتیں کس طرح منہدم ہو جاتی ہیں اور یہ کہ کرسی کے واسطے الیکشن لڑنے کے لیے ہر آدمی کیوں لاکھوں روپے خرچ کر دیتا ہے جبکہ اس کی آمدنی خود رام لال کی آمدنی سے بھی کم ہوتی ہے۔

لیکن رام لال کے پاس چپ چاپ ''یس سر''، ''آل رائٹ سر'' کہنے اور فون سنتے رہنے اور ملاقاتوں کا وقت طے کرتے رہنے اور ڈکٹیشن لیتے رہنے اور ٹائپ رائٹر کوٹتے جانے کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا، ویسے نوکری سے الگ اس کی کوئی شناخت ہی نہیں تھی، رام لال؟ کون رام لال؟ رام لال ولد بھیروں پرشاد۔ وہ کون بھئی اس دیش میں لاکھوں رام لال شلجم کے بھاؤ بکتے ہیں اور لاکھوں ہی گوداموں میں پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں، جی وہ رام لال جو میونسپلٹی کے بڑے دفتر یعنی ٹاؤن ہال میں کام کرتا ہے اور فلانے کونسلر کا پرسنل اسسٹنٹ ہے، اچھا وہ۔

بس یہی اس کی پہچان تھی۔

پھر گھر میں تین بچے تھے جنھیں روٹی چاہیے تھی اور جو بڑے ہو رہے تھے، ملک کا مستقبل۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ اس مستقبل کے پاجاموں کی سلائی میانیوں پر سے ادھڑی رہتی تھی قمیصوں کے کالر چیتھڑوں کو بھی شرماتے رہتے تھے، کیونکہ وہ قمیصیں تقریباً ہمیشہ ہی رام لال کی پھٹی قمیصوں کو تراش کر چھوٹی کر کے اس مستقبل کو پہنا دی جاتی تھیں۔ رام لال کی گھر والی پریما کو بانہیں چھوٹی کرنا، لمبائی کم کرنا، چوڑائی گھٹانا تو آتا تھا کیونکہ یہ سب کام سوئی دھاگے سے تھوڑی سی کشتی لڑنے سے ہو جاتے تھے، لیکن اسے کالر بنانا نہیں آتے تھے تو کالر ملک کی بدنصیب اور بھوک اور غریبی کی طرح کئی کئی نسل تک چلتے اسی طرح رام لال کی گردن کے گرد سے اُتر کر رام لال کے بچوں یعنی ملک کے مستقبل کے گلوں کے گرد لپٹ جاتے تھے اور اس مستقبل کو ہمیشہ اسکول کے ماسٹروں اور ماسٹرنیوں کی پھٹکار پڑتی رہتی تھی۔ کبھی فیس لیٹ لانے کے لیے، کبھی کپڑے گندے پہننے کے لیے، کبھی فیل ہونے پر، کبھی دنگا فساد کرنے پر۔

ملک کے اس مستقبل کا بوجھ رام لال کے کندھوں پر تھا۔ اس لیے یہ اپنے کندھے جھٹکار بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں تو زمین کو اُٹھا کر کھڑے ہوئے اٹلس دیوتا کو بھی کبھی کبھار کندھے جھٹکنے اور کندھے کا بوجھ بدلنے کا حق ہے، اسی وجہ سے زلزلے آتے ہیں لیکن زلزلوں سے اٹلس دیوتا کے بیوی بچے تو نہیں مرتے نا، اور اگر رام لال کہیں بھگوان نہ کرے اپنے کندھے جھٹک بیٹھے تو زلزلہ کے ملبہ کے نیچے وہ خود بھی دب جائے گا اور یقیناً اس کے بیوی بچے بھی تو صاحبانِ دیوتاؤں کی بات اور ہے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کندھے جھٹک سکتے ہیں، پہاڑ اُٹھا کر مرتے

ہوئے آدمی کے لیے دوا لا سکتے ہیں۔ بیوی کی طرف کوئی بری نظر سے دیکھے تو اس کا گھر جلا کر راکھ کر سکتے ہیں۔ مکھن چرا سکتے ہیں۔ غسل کرتی ہوئی عورتوں کو سنسرکٹ کے بغیر ننگا دیکھنا ہو تو ان کے کپڑے اُڑا کر رفو چکر ہو سکتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں سے عشق لڑا سکتے ہیں۔ اپنی حاملہ بیویوں کو جنگلوں میں دھکّے دے کر نکال سکتے ہیں۔ آگ میں بٹھا کر اپنی بیویوں کی پاکیزگی کا امتحان لے سکتے ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ تو دیوتا ہوئے لیکن رام لال جیسا معتبر آدمی زمین پر رینگنے والا محض ایک کیڑا، وہ صرف خاموشی سے سب کچھ برداشت کر سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

برسات شروع ہوگئی۔ دو دن موسلادھار پانی برسا اور تیسرے دن سویرے ایک نو تعمیر شدہ اسکول کی عمارت کی چھت گر پڑی اور ملبہ کے نیچے آ کر چار بچے مر گئے اور ۲۳ زخمی بچوں کو خطرناک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔

اس بلڈنگ کا ٹھیکہ جن لوگوں کے پاس تھا ان کے بارے میں رام لال سب کچھ جانتا تھا، کیسے اس کے صاحب نے ان لوگوں سے رام لال کے ذریعے ہی کہلوایا تھا کہ صاحب کی ہزار گز زمین پڑی ہے چنڈی گڑھ میں، کوٹھی بنی ہے، اگر کوئی اچھا آرکیٹکٹ ہو ان کے پاس تو نقشہ بنوا دیں اور ان لوگوں نے ہنس کر کہا تھا صرف نقشہ ہی کیوں وہ کوٹھی ہی بنوا دیں گے۔

رام لال کو بہت کوفت ہوئی، اسے لگا تھا کہ وہ چوروں کو نقب لگانے میں مدد کر رہا ہے۔

اور ان لوگوں نے کونسلر صاحب کی کوٹھی چار پانچ مہینوں ہی میں بنوا دی تھی۔ بڑھیا سلیقہ دار ڈیڑھ منزلہ، ٹمبر دلّی سے گیا تھا۔ سنگِ مرمر مکرانے سے آیا تھا، ٹائلیں بمبئی سے، سینیٹری فٹنگز اور بلبوں کے شیڈ اور پنکھے صاحب کی بیگم نے خود پسند کیے تھے۔ ٹھیکیدار کے ساتھ جا جا کر کئی بار رام لال کو بھی بیگم صاحبہ کی مدد کے لیے ساتھ جانا پڑا تھا۔ حکم تھا جس کی تعمیل اس کا کام تھا۔

کوٹھی تو کونسلر صاحب کے بچوں اور پوتوں تک بھی پختہ رہنی چاہیے تھی، اسکولوں کی عمارتوں کا کیا ہے، وہ چاہے کل ڈھے جائیں، ان کے ملبہ کے نیچے آنے والے بچے ہندوستان کے کوڑے کباڑ کے ڈھیر کے کیڑے ہیں، سو کیا فرق پڑتا ہے۔ پیدا ہی ہوتے ہیں کمبخت اتنے زیادہ کلبل کلبل کرتے ہوئے اور کون کہتا ہے ان سے کہ ضرور اسکول جائیں ہی، باقی بچوں کی طرح وہ بھی بوٹ پالش کر سکتے ہیں، فیکٹریوں میں رات برات کام کر سکتے ہیں، بوجھ ڈھو سکتے ہیں، برتن مانجھ سکتے ہیں، اخبار بیچ سکتے ہیں، کیوں نہیں کرتے یہ سب، چل دیتے ہیں اسکول۔ وہ نہیں جانتے کہ سرکاری اسکولوں کی عمارتیں کچی ہوتی ہیں اور بارش میں ملبے کا ڈھیر بن سکتی ہیں۔

رام لال کو دن بھر غصہ آتا رہا ان مرنے والے بچوں پر، اپنے آپ پر، ہوا پر، بارش پر، کرسی پر، میز پر، چپراسی پر، سب پر۔

تیسرے پہر اس کے صاحب نے اسے بلایا۔ ''ارے بھئی لال اس اسکول کی بلڈنگ کے کنٹریکٹ کی ساری فائلیں یعنی آج تک کے سارے ٹھیکے جو انھیں ملے ہیں سب فائلیں جمع کرواور شام کو لے کر کوٹھی آ جاؤ۔

شام کو جب رام لال فائلوں کا گٹھر لے کر صاحب کی کوٹھی پہنچا تو وہ ٹھیکیدار اور اس کا بیٹا صاحب کے ساتھ بڑے کمرے میں بیٹھے وسکی پی رہے تھے۔ ''آ بھائی رام لال یہ فائلیں یہاں رکھ دے اور ذرا اسکول کی بلڈنگ سے متعلق سارے کاغذ فلیپ کر دے رات کو دیکھوں گا۔''

ٹھیکیدار نے رام لال کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک پیگ اس کے لیے بھی بنا دیا۔ رام لال نے کہا اس نے تو کبھی نہیں پی ہے شراب۔ ''نہیں نہیں یہ تو ضرور پینی پڑے گی۔ یہ تو ہم آفر کر رہے ہیں، نہیں پیئیں گے تو ہماری انسلٹ ہوگی۔'' ٹھیکیدار نے کہا۔

کونسلر صاحب نے بھی مسکرا کر اس کی تائید کی۔

اور رام لال نے ایک ہی بار میں وہ پیگ اندر انڈیل دیا اور گلاس ٹھیکیدار کے سامنے کر دیا۔

دوسرا پیگ پی کر اس نے اطمینان سے بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ عجیب بات ہے اس کوٹھی میں وہ پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا لیکن ہر بار نیچی آنکھ کیے ضروری کام کر کے چلا جاتا تھا، لیکن آج اس نے دو پیگ پینے کے بعد نظر اوپر اُٹھائی اور آنکھ بھر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اپنے صاحب کو ٹھیکیدار کو صاحب کی بیگم کو دیواروں کو ایرانی قالینوں کو رنگین ٹی وی کو ویڈیو کو میوزک سسٹم کو صوفوں کو ڈنر سیٹوں کو کٹ گلاس کے پھولدانوں کو پھولدانوں میں سجے ہوئے پھولوں کو۔

اور پھر نہ جانے کیا ہوا وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا۔ اورے رام لال کتے کمینے کیا کمایا تو نے ساری زندگی۔ او حرامی تجھ سے اپنے بچوں کا پیٹ بھی نہیں بھرا جا سکا۔ اے لعنتی تجھ سے اسکول کی چھت کے نیچے آ کر مرنے والے بچے بھی نہیں بچائے گئے۔ نامراد تجھ سے اپنا نہ کچھ سنورا نہ دوسروں کا، ڈوب مر اے او رام لال ڈوب مر۔''

لڑکھڑاتا ہوا وہ گھر لوٹا ساری رات وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا، اپنے آپ کو گالیاں دیتا رہا اور سویرے نہا دھو کر بلیڈ سے شیو کر کے تیار ہو کر دفتر جا کر بڑے اطمینان سے ٹاؤن ہال کی چوتھی منزل پر پہنچا اور وہاں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

○○

نہ مارو

رات اندھیری تھی، دُور سے کتے بھونکنے کی آواز اندھیرے کو اور پر ہول بنا رہی تھی۔ گھر کے کسی کونے میں چھپی ہوئی ٹیری لگاتار منمنا رہی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی جب سے میرے بھائی کیول کا قتل ہوا تھا نہ مجھے نیند آتی تھی اور نہ ہی ماں کو دونوں ایک دوسرے کو بہلانے کے لیے سونے کا بہانہ کرتی رہتیں۔

وہ کہتے تھے میرے بھائی کا قتل دہشت گردوں نے کیا تھا۔ میں نہیں جانتی ان کی کسی سے کیا دُشمنی تھی؟ لیکن قتل تو کوئی بھی کر سکتا تھا۔ دہشت گرد بھی اور کوئی دوسرا بھی۔

قتل کرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ برسوں پال پوس کر جوان کیا لڑکا اور ایک گولی بس جیسے کوئی پھولے ہوئے غبارے میں سوئی کی نوک چبھا دے، جیسے کوئی لفافہ پھٹ جائے، آدمی چلتے پھرتے تو آدمی ہیں بس اس میں ایک سوراخ کر دو تو سارا لہو بہہ کر باہر آ جاتا ہے اور باقی بچتی ہے لاش مٹی۔ سب ہی کہتے ہیں مٹی کو ٹھکانے لگا دو، یہی کہا تھا سب نے۔

ابھی مہینہ بھر بھی تو نہیں ہوا اور لگتا ہے صدیاں گزر گئیں۔ نہ تو اُٹھنے کو دل ہوتا ہے نہ ہی کچھ پکانے کو۔ یوں جب مجھے ماں کی فکر ہوتی ہے تو میں چولھا جلا کر دو روٹیاں سینک لیتی ہوں اور جب ماں کو میری فکر ہو تو وہ چولھا سلگا لیتی ہے۔ ایک دوسرے کو بہلانے کے لیے، پھر ہم دونوں تھوڑا بہت گلے سے نیچے اُتار لیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے میرے بھائی کو سرلا کے بھائیوں نے ہی مار ڈالا ہو، کتنی بار تو دھمکیاں دی تھیں، اُنھوں نے۔ سرلا؟ برہمن کی لڑکی اُونچی ناک والوں کی بیٹی اور میرا بھائی کمبوہوں کا لڑکا کہتے ہی ہمارے دادا پردادا رنگریز تھے، لیکن باپ تو ڈاکخانے کی نوکری کرتے تھے اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو اُنھوں نے کالج تک پڑھایا تھا۔ کہا کرتے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا لیکن ان کے کہنے سے کیا ہوتا۔ میری سہیلیاں پاس پڑوس کی لڑکیاں اسکول اور کالج پڑھنے والی یہی کہتی تھیں سب ہی چھوٹے لوگ یہی کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا لیکن چھوٹا بڑا اب نہ ہو جب

بڑے لوگ بھی ایسا کہیں۔

میں نے بھی ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دی لیکن جب سے کیول کا قتل ہوا ہے، مجھے یہی اوٹ پٹانگ باتیں یاد آیا کرتی ہیں۔ یاد بھی نہیں، بس یونہی باتوں، بے سر و پیر کی باتوں کا میرے چاروں طرف ہنگامہ سا برپا رہتا ہے۔ اس اندھیری رات میں مجھے لگا جیسے کوئی خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا ہو۔ آجکل اکثر ایسا ہی لگتا ہے ایک بے بنیاد سا خوف جیسے اندھیرے میں سے کسی خونخوار جانور کی دو آنکھیں میری طرف تاک رہی ہوں۔ بھلا اب کا ہے کا خطرہ؟ ایک برس سے جب بھی کیول گھر سے باہر جاتا ہم دونوں کو مجھے اور میری ماں کو ایسا ہی خطرہ گھات لگائے کونے میں سے جھانکتا دکھائی دیتا لیکن اب تو کیول ہی نہیں رہا، اب کیسا خطرہ؟ موت سے بڑا بھی کوئی خطرہ ہوتا ہے۔

دوسرے کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی تو مجھے لگتا کہ کتے ہمارے گھر کی طرف منہ اٹھا کر ہی بھونک رہے ہیں۔

میں دبے پاؤں اٹھی۔ اٹھ کر تینوں کمروں میں چکر لگایا، جھک کر چارپائیوں کے نیچے دیکھا، مدھم سے بلب کی دھندلی سی روشنی میں چارپائیوں کے نیچے صرف ان کی پرچھائیاں ہی سہم کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا جیسے یہ پرچھائیاں ہل رہی ہیں، کروٹ بدل رہی ہیں، خوف میرے گلے میں ایک سخت گولے کی طرح پھیل گیا تھا۔ میں اس خوف کو جیسے بہلا رہی تھی "اب کا ہے کا ڈر، کیول کو تو انھوں نے مار ہی ڈالا ہے اب کیسا ڈر؟"

کیول کو ضرور سرلا کے بھائیوں نے ہی مارا ہوگا، ویسے کوئی بھی مار سکتا ہے یہ سکھ بھی جن کا نیا نام دہشت گرد ہے، کوئی دوسرا بھی۔

تینوں کمروں میں سے ہو کر میں پچھلے آنگن میں سے نکل آئی۔ نل سے رہ رہ کر ایک بوند نکلتی اور ٹپ سے فرش پر آ پڑتی۔ ہر دو تین سیکنڈ بعد "ٹپ" لگاتار۔

اندھیرے کا بھی کیسا کرشمہ ہوتا ہے۔ دور پڑی ٹونٹی ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی آدمی پیٹ سے گھٹنے لگائے بیٹھا ہو۔ گھٹنے کے گرد بانہیں لپیٹ کر دور پڑی بالٹی میں بھی کوئی آدمی چھپ کر بیٹھا ہو سکتا تھا اور کونے میں پڑی چارپائی کے نیچے بھی کیا معلوم؟

پچھلی طرف باورچی خانہ سے ملحق ایک کمرہ تھا جس میں پیازوں اور گیہوں کا ڈھیر پرانے بستر اور گدے رضائیاں پڑی تھیں۔ کچھ لکڑی کی پرانی پیٹیاں بھی تھیں۔ ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی جن میں جانے کب سے چھٹ پٹ سامان پڑا تھا۔ کئی بار ماں سے کہا تھا یہ کباڑ پھینک دو۔ ماں کہتی۔ "چیزیں پھینکنے سے گھر نہیں بنا کرتے، سنبھالنے سے بنتے ہیں۔"

میں حیران ہوتی کہ اور گھروں میں بھی اسی طرح کے کاٹ کباڑ اور صدیوں پرانی چھوٹی موٹی چیزوں کے ڈھیر ہوں گے۔ ہوں نہ ہوں ہمارے گھر میں تو تھے، مجھے ان پرانی پیٹیوں سے نفرت تھی کیونکہ ان میں سے مجھے تمام گزر چکے آدمیوں کی اور گزرے زمانے کی بوآتی تھی۔ لیکن سخت اندھیرے اور رات کے اس پہر میں جب آدمی سوتے تھے اور کتے جاگتے تھے اور یا پھر جاگتے تھے وہ لوگ جو نہ زندہ تھے نہ مُردوں میں تھے، جس طرح میں تھی اور میری ماں تھی میں نے اس کوٹھری کا بند دروازہ کھول کر اندر جھانکا، اندھیرا تھا۔ میں نے بتی جلائی، مدھم سا بلب جل اُٹھا۔ حیرانی ہوئی کہ اتنی دیر بعد بلب جل کیسے اُٹھا، میں نے بے خیالی سے کوٹھری کا چکر لگایا اور اچانک ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پیٹیوں کے پیچھے وہ دُبک کر بیٹھا تھا۔ اپنی لہولہان ٹانگ کو دونوں مٹھیوں سے بھینچے ہوئے، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب خوف تھا۔ زخمی خرگوش کی آنکھیں تھیں، وہ مجھ سے ڈر رہا تھا اور میں اس سے۔ میری ٹانگ کانپ رہی تھی، وہ کون تھا، اس اندھیرے میں وہ میرے گھر میں چھپا کیا کر رہا تھا۔ میں شور مچا دوں، لیکن آواز تو میرے گلے میں جم کر رہ گئی تھی، میں اسے بانہہ سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں لیکن وہ تو زخمی تھا اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی دونوں مٹھیوں میں دبی ہوئی اس کی ٹانگ اچانک وہ کراہ اُٹھا "پانی۔"

مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں، میں باورچی خانہ سے پانی کا گلاس لینے چلی گئی۔ پانی لا کر میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا، میرا ہاتھ کانپ رہا تھا، میں ابھی بھی اس سے ڈر رہی تھی حالانکہ جانتی تھی وہ میرے رحم وکرم پر ہے، میرے رحم وکرم پر اور میرے پانی کے رحم وکرم پر۔

اس نے میرے ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا۔ پکڑا ابھی نہیں، ایک ہڑبڑاہٹ، ایک بوکھلاہٹ میں اس نے پانی میرے ہاتھ سے چھین لیا، میں چپ چاپ کھڑی اس کے گلے سے آتی ہوئی گٹ گٹ کی آواز سنتی رہی۔ گلاس خالی کر کے اس نے میری طرف بڑھایا، میں چپ چاپ گلاس لے کر باورچی خانہ میں گئی اور ایک گلاس اور بھر لائی۔ اس بار اس نے میرے ہاتھ سے گلاس نہیں چھینا۔ آہستہ سے پکڑ لیا اور دھیرے دھیرے آدھا گلاس خالی کر کے باقی آدھا اپنے پاس نیچے رکھ دیا۔

میں ابھی بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خوف کا بھی شاید ایک اپنا جادو ہوتا ہے، وہ جادو ہمیں نہ ہلنے دیتا ہے اور نہ بولنے دیتا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا، اب اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ ایک سیاہ خاموشی تھی اور مجھے لگا اس کالی خاموشی میں غصہ کے دو چار لال اور کاسنی دھبے ڈوب اور اُبھر رہے تھے، لیکن وہ غصہ میرے لیے نہیں تھا، وہ اس کے اپنے بے

سہارا اپنی پر تھا، اس کی اپنی لا چاری پر تھا، اس کے اپنے زخم پر تھا۔

''تم ڈرو مت بہن، میں ذرا اُٹھنے لائق ہو جاؤں تو چپ چاپ جاؤں گا اپنے آپ۔''

وہ بولا اور خوف کی سل میرے گلے میں پگھلنے لگی۔ وہ بولا اور ڈر کر برف میری چھاتی سے پگھلنے لگی۔

میں چپ چاپ پھر باورچی خانہ میں گئی اور کاڑھنی میں سے دُودھ کا گلاس بھر لائی۔ اس نے دُودھ بھی آہستہ آہستہ پی لیا۔ گلاس مجھے تھما کر اسی ہاتھ سے اپنا منہ پونچھ لیا۔

''کوئی کپڑا ہے ٹانگ پر باندھ لوں۔''

میں نے ایک پیٹی کھولی۔ ماں کا ایک پرانا دوپٹہ نکال کر کھول کر اسے پکڑا دیا، اس نے دوپٹے کا سرا اپنے زخم پر رکھا اور ٹانگ کے اِردگرد تین چار بل دیے پھر وہ دوپٹے کے سرے میں گانٹھ لگانے لگا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، میں نے دونوں سرے اس کے ہاتھ میں پکڑ لیے اور کس کر گانٹھ لگا دی۔

''گولی لگی ہے۔'' وہ بولا۔

''گولی۔'' میں چونک اُٹھی۔

''ہاں پولیس کے کتّوں کی گولی۔''

''پولیس۔'' میری آواز کانپ گئی۔

''نہیں میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں۔'' اور وہ رُک گیا۔

''دہشت گرد۔'' میں نے آواز کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ کانپ رہی تھی۔ مجھے لگا وہ مسکرا رہا تھا، اس کے ہونٹ نہیں بس اس کی آنکھوں میں سے گزرتی ہوئی مسکراہٹ کی مجھے جھلک دِکھائی دی۔

''دہشت گرد وہ کون سا جانور ہوتا ہے بہن۔''

اور پھر اس کے زخم میں ٹیس اُٹھی، اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھوں میں سے کالک بھرنے لگی، اس کے جبڑے بھنچ گئے اور چہرے کی چمڑی کے نیچے اس کے اعصاب اینٹھ گئے۔ زخم سے اُوپر اس نے اپنی ٹانگ کو دونوں گھٹنوں میں کس کر بھینچ لیا۔

''تم جا کر سو جاؤ بہن، درد ذرا دب جائے تو میں چپ چاپ اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔''

''کہیں نہیں جاؤ گے تم۔'' نہ جانے کس حق سے میں نے کہہ دیا۔ ''اس حالت میں کہیں نہیں جاؤ گے تم۔''

میں اُٹھی اور باہر سے کوٹھری میں تالا لگا دیا اور آ کر اپنی چار پائی پر لیٹ گئی۔ نیند تو روٹھے ہوئے مہمان کی طرح چلی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی رات کو میں محسوس کرنے لگی۔ کالی بلی کی طرح دبے پاؤں سہم کر چل رہی رات کو۔

بہت دیر گزر گئی۔ مجھے لگا دن چڑھنے کو تھا، اچانک میں چونک کر اُٹھی، دن چڑھ آیا تو وہ بے چارہ رفع حاجت کے لیے کیسے جائے گا، میں اُٹھی، پانی کا لوٹا بھرا، کوٹھری کا تالہ کھولا، وہ کراہ رہا تھا، کوئی آواز نہیں تھی، بس ٹھہری ہوئی ہوا میں ہوا کی ہی ایک بے آواز چیخ جیسے خالی ہوا کو ٹھوس ہوا کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہو۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''دن چڑھ آیا تو تم باہر کیسے جاؤ گے یہ پانی۔ اور میں نے ہاتھ اُٹھا کر لوٹا دکھایا۔ ''دھیرے دھیرے اُٹھ کر اس دیوار کے باہر'' اور میں جھجک سی گئی'' میں تمھاری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاؤں گی، دھیان رکھوں گی کوئی دیکھ نہ پائے۔''

وہ لڑکھڑا سا اُٹھا، میں نے اس کی بانہہ تھام لی۔ باہر کے دروازے کی کنڈی دھیرے سے کھولی۔ باہر کی دیوار سے لگ کر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ پاس ہی پانی کا لوٹا رکھ دیا۔ اور خود اپنے دوپٹے کو اس کے آگے تمبو کی طرح تان کر پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی۔

مجھے لگا میں کوئی مرغی تھی اور میں نے اپنے پروں کے نیچے اپنے چوزے کو چھپا رکھا تھا کیونکہ چاروں طرف آسمان پر کالی چیلیں چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ جیسے میرا بے سہارا لاچار بیٹا تھا۔ میرے کنوارے سینہ سے ممتا چھلک رہی تھی۔ اسے اُٹھا کر میں نے ایک ہاتھ سے خالی لوٹا پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بانہہ تھام لی۔ واپس لا کر میں نے اسے پیٹیوں کے پیچھے بٹھا دیا اور پھر بستر والے بکسے میں سے ایک گدا نکال کر اس کی ٹانگ کے نیچے رکھ دیا، سہارا بنا کر دوسرہانے اور ایک کھیس نکال کر میں نے اسے دے دیے، رات کا پچھلا پہر تھا اور ہوا میں کچھ ٹھنڈک تھی۔

صبح ہوئی تو پولیس کے دو آدمی ہمارے گھر میں آئے۔ پولیس کا آنا کوئی انہونی بات نہیں تھی کیونکہ جب سے کیول کا قتل ہوا ہے دوسرے چوتھے روز پولیس آتی ہی رہتی ہے لیکن آج پولیس کے ان دو آدمیوں کو دیکھ کر میں سہم اُٹھی کہنے لگے۔ ''کل رات کو چار پانچ دہشت گردوں نے پولیس کے دو سپاہیوں کو گھیر کر ان سے بندوق چھین لی اور جب وہ لوگ بھاگے جا رہے تھے تو کسی تیسرے پولیس کے آدمی نے ان پر گولی چلا دی، وہ سب ہی بھاگ گئے لیکن شک ہے کہ کم سے کم ایک کو ضرور گولی لگی ہے۔ کیونکہ خون کے چھینٹے مٹی میں پڑے پائے گئے

ہیں اور شاید وہ زخمی بھاگ کر اسی گلی میں آ گھسا ہے لیکن آپ لوگ نہ ڈریں، ذرا کنڈی لگا کر رکھیں وقت بے وقت باہر نہ نکلیں۔ گلی کے سب ہی سکھوں کے گھروں کی تلاشیاں لے رہے ہیں۔ بھاگ کر جائے گا کہاں، کسی نے چھپایا ہوگا تو مل جائے گا نہیں تو ہوگا گاؤں ہی میں کہیں۔ ڈھونڈ نکالیں گے، اگر اس کے ساتھی اسے اُٹھا کر اور کسی ٹرک میں ڈال کر کہیں دوسری جگہ نہیں لے گئے تو۔ ویسے پولیس کو اسی گروپ پر شک ہے کہ اُنھوں نے ہی آپ کے کیول کو بھی مارا ہے۔ سالے بہن کے یار بچ کر جائیں گے کہاں ایک ایک کو پکڑ کر۔''

وہ بولتے جا رہے تھے۔ میری ماں ہونٹوں پر دوپٹے کا پلو رکھے چپ چاپ سن رہی تھی اور میں دروازے کے پاس کھڑی اپنی رگوں میں دوڑتے لہو کی آواز سن رہی تھی۔

دوپہر ہوگئی تھی لیکن میں کوٹھری میں نہیں جا پائی تھی۔ میری ماں گھر میں اِدھر اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ وہ آجکل اسی طرح ڈولتی رہتی تھی جیسے اس کی چیز کھوگئی ہو اور اسے یاد نہ آ رہی ہو کہ کیا کھویا تھا اور وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

آخر دوپہر کی روٹی کھا کر وہ رامائن کھول کر بیٹھ گئی۔ میں نے چار فالتو پکائی ہوئی روٹیوں پر بیگن کی سبزی رکھی۔ دوپٹے سے ڈھک کر میں نے آہستہ سے تالا کھولا اور کوٹھری کے اندر چلی گئی۔

دن کی روشنی میں وہ مجھے سہمے ہوئے بچھڑے کی طرح لگا۔ رات سے بھی چھوٹا اس کے گالوں کے دونوں طرف اور اوپری ہونٹ پر اور ٹھوڑی پر مہین بھورے بھورے روئیں تھے۔ مجھے لگا اس کی ٹھوڑی پر نیچے ضرور ایک چھوٹا سا گڈھا ہوگا۔ ٹھوڑی کے بیچوں بیچ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے آہستہ سے اس کی بانہہ کو انگلیوں سے ہلا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، آنکھوں میں درد تیر رہا تھا، درد اور بے خوابی سے اس کے پپوٹے کچھ سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔

میں نے روٹیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ اس نے کہا ''بھوک نہیں ہے۔'' اور پھر کراہتے ہوئے اس نے زخمی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کچھ سیدھا کیا۔

''بھوک نہ ہو تو بھی کھانا ہوگا۔'' میں نے اسے حکم دینے کی طرح اور بڑی ہونے کے ناطے کہا جیسے بچوں کو ڈانٹا جاتا ہے۔

اس نے چپ چاپ روٹیاں پکڑ لیں اور کھانے لگا۔ میں نے رات والا پانی کا گلاس اُٹھایا، خالی تھا۔ باورچی خانہ میں جا کر میں گلاس بھر لائی۔

میں نے دیکھا رات والے دوپٹے پر جو اس کے زخم کے گرد لپٹا ہوا تھا کالا خون جم گیا تھا اور اس کی ٹانگ دوپٹے کے دونوں طرف سے لال ہوگئی تھی اور سوجی ہوئی تھی۔

''بہت درد ہے۔'' میں نے محبت بھری آواز میں پوچھا۔

''ہاں گولی اندر ہی ہے ٹانگ میں۔''

سن کر مجھے عجیب طرح کا دھکا لگا۔ آدمی کے گوشت کو پھاڑ کر اندر گوشت اور خون میں چھپی ہوئی گولی۔ عجیب احساس تھا یہ۔

اسپتال۔ میں جانتی تھی یہ کتنا فضول خیال ہے۔ آج کس اسپتال میں اہلیت تھی اس کا علاج کر پانے کی۔ دُنیا کے کبھی ڈاکٹر اور کبھی اسپتال اس کے زخم کا علاج نہیں کر سکتے۔ کبھی ڈاکٹروں کے اوزار بیکار ہوگئے تھے اور سب ہی اسپتال راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔

میں چپ چاپ کوٹھری سے باہر نکل آئی اور کوٹھری کو تالہ لگا دیا۔ آنگن میں دوپہر کے پچھلے پہر کی دُھوپ کاہلوں کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ آنگن کو پار کرکے میں سامنے کے کمرے میں آئی۔ ماں ابھی بھی رامائن پڑھ رہی تھیں، لیکن ایسا لگ رہا تھا ان کا دھیان کہیں دُور بھٹک رہا تھا۔ میں نے پٹاری سے ایک مڑا تڑا سا نوٹ نکالا، دوپٹہ سنبھالا اور گلی میں آ گئی۔ گلی میں ہی دُور بساطی کی دُکان کے باہر تین سپاہی لمبے بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں دوسری طرف سے گلی سے باہر نکلی اور گھوم کر باہر والے بازار کی دوائیوں والی دُکان پر آ گئی۔

''ڈیٹال کی ایک شیشی، روئی کا ایک بنڈل اور پٹیاں۔'' میں نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی آواز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹا سا قصبہ تھا، ہر کوئی ہر کسی کو جانتا تھا۔ دوائیوں کی دُکان والا، جسے ہم سب ڈاکٹر ہی کہتے تھے لیکن وہ ڈاکٹر تھا نہیں کہنے لگا۔ ''کیا ہوا، کہیں ماں جی گر تو نہیں پڑیں۔''

کیول کی موت کے بعد سب کی آواز ہمارے لیے کچھ زیادہ ہی نرم ہوگئی تھی، میں نے کہا۔ ''نہیں، ہاں ذرا پیر میں کنڈی لگ گئی تھی۔''

''میں گھر آ کر پٹی کردوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں کوئی خاص نہیں۔ میں خود ہی کردوں گی۔'' اس بار میری آواز شاید کچھ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے چشمہ کے شیشوں کے پیچھے سے نظر اُٹھا کر دیکھا اور ڈیٹال کی شیشی روئی کا بنڈل اور پٹیوں کے گولے ہاتھ میں تھما دیے۔

سب ہی چیزوں کو دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوئی۔ یہ سب اس طرح لے کر میں گلی میں سے

کیسے گزروں گی۔ ''کوئی لفافہ'' میں نے اس سے کہا اس نے لفافہ نکال کر سب ہی چیزیں اس میں ڈال دیں۔

دوائیوں کی دکان سے نکال کر میں پرچون کی دکان پر گئی۔ نمک کی تھیلی اور چار ماچس کی ڈبیہ لے کر اسی لفافہ میں اوپر اوپر رکھ لیں اور گھر آ گئی۔ وہ تینوں سپاہی ابھی بھی اسی بنچ پر ہی بیٹھے تھے۔

کوٹھری میں جا کر میں نے اس کے زخم سے دوپٹہ اُتارا۔ زخم کے آس پاس سیاہ خون جم گیا تھا۔ ڈیٹال میں روئی بھگو بھگو کر میں نے اس کا زخم صاف کیا۔ ایسا بھیانک زخم میں نے پہلی بار کیول کے جسم پر دیکھا تھا۔ گولی کا زخم لیکن وہ بالکل بے چارا سا لگا تھا۔ ایک سوراخ اور سوراخ کے آس پاس خون کی دھاریں اس طرح سوجا ہوا اور خطرناک نہیں تھا وہ زخم۔ میرے سر میں اندھیرا گھر آیا تھا جسے میں اپنی پوری طاقت سے کہیں پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے کانوں میں بیہوش ہو رہے لہو کی سائیں سائیں ہو رہی تھی لیکن میں اسے پوری طاقت کے ساتھ اَن سنا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زخم صاف کر کے میں نے روئی کا بڑا سا پھاہا ڈیٹال میں بھگو کر اس پر رکھا اور پٹی باندھ دی۔ اس نے اپنی ٹانگ زخم سے اُوپر دونوں ہاتھوں میں کس کر پکڑی ہوئی تھی اور تکلیف سے اس کے چہرے پر ہزاروں کالی لکیریں کھنچ آئی تھیں۔

باورچی خانہ میں جا کر میں گنگنے دودھ کا گلاس بھرا اور لا کر اس کے پاس رکھ دیا۔ باہر سے کوٹھری کو تالہ لگایا اور راکھ اور مٹی سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے لگی تو بھی لگتا رہا کہ ڈیٹال کی بو ہاتھوں سے نہیں جا رہی۔ باورچی خانہ میں جا کر میں نے چائے بنائی، ایک گلاس ماں کے آگے رکھ دیا اور چارپائی پر بیٹھ کر دوسرے گلاس میں سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔ میری آنکھوں کے آگے صرف بری طرح سوجا ہوا اور کالے خون سے بھرا ہوا زخم تھا یا پھر باہر گلی میں دکان کے سامنے بنچ پر بیٹھے ہوئے تین سپاہی۔ پتہ نہیں کس وقت میں سو گئی۔

سوتے ہوئے بھی جیسے میں جاگ رہی تھی۔ میرا ایک حصہ تھا جو چوکنا ہو کر جاگ رہا تھا۔ اور میرا سویا ہوا حصہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے سپاٹ میدان تھے۔ بھاگتے ہوئے خرگوش تھے اور خرگوش کا پیچھا کرتے ہوئے خونخوار کتے۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کے ساتھ ہی میں چونک کر اُٹھ گئی۔ شام کا اندھیرا کمرے کی درازوں میں سہم کر بیٹھ گیا تھا۔ ماں کمرے میں نہیں تھی اور دور کہیں کتے بھونک رہے تھے۔

میں اُٹھ کر پچھلے آنگن میں آ گئی۔ ماں چولھا جلا کر اس کے پاس ہی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی اور لکڑیوں میں سے اُٹھ رہی لپٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ چولھے پر شاید دال چڑھا رکھی تھی۔

میں بالکل پاس آ کر کھڑی ہوگئی تو اس نے دھیرے سے سر اُٹھایا۔ ''کیوں سر درد تو نہیں ہے۔ کب سے سو رہی ہو۔''

جاگ کر بھی کیا کرنا ہے۔ میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن چپ رہی۔ اس سلگتی ہوئی خاموشی میں میں نے ایک بار کوٹھری کی طرف دیکھا اور پھر ماں سے کہا ''اُٹھو ماں روٹیاں میں سینک دیتی ہوں۔''

ماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

ماں کو کھانا دے کر میں نے کٹوری میں دال نکالی اس میں چمچہ بھر گرم گھی ڈالا اور تھالی میں روٹیاں رکھ کر دھیرے سے کوٹھری کا تالہ کھولا۔

وہ شاید سو رہا تھا۔ میں نے اس کی بانہہ کو چھوا۔ بھٹی کی طرح تپ رہی تھی، تھالی نیچے رکھ کر میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی ہر سانس میں ایک ہلکی سی کراہ شامل تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ کو دیکھا۔ پٹیوں کے اوپر کالا خون رس رس کر جم گیا تھا اور ٹانگ اب بہت سوج چکی تھی۔

ایک عجیب بے بسی میں میں کمرے سے باہر آ گئی۔ تالہ پھر لگا دیا۔ مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔

آدھی رات کو اُٹھ کر میں کوٹھری میں گئی۔ بتی جلائی وہ اپنی ٹانگ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی کراہیں لمبی ہوگئی تھیں۔ میں نے اسے ہاتھ لگایا وہ اُٹھا نہیں۔ روٹی اسی طرح تھال میں پڑی تھی اور دال پر گھی کی سفید تہہ جم گئی تھی۔

پانی کا گلاس لے کر میں نے اس کا سر اُٹھایا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پتہ نہیں وہ جاگ رہا تھا کہ سو رہا تھا۔ ہوش میں تھا یا بے ہوش۔ دو گھونٹ پانی اس نے پی لیا اور پھر اپنی ٹانگ پر جھک گیا۔

وہ گٹھری کی طرح وہاں پڑا تھا۔ پرانی پٹیوں کے پیچھے اور باہر خطرہ اس کا سراغ کھوج رہا تھا۔

اگلے دن وہ اسی طرح بخار سے تپتا ہوا پڑا رہا۔ شام کے وقت میں نے زبردستی اسے گرم

دُودھ کے دو گھونٹ پلائے۔ ایک بار اس نے آنکھیں کھولیں، دھیرے سے کہا ''میں یہاں نہیں مروں گا۔ آپ کو میری لاش باہر نکالنے میں بہت مشکل لگے گی بہن۔'' ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ بول رہا تھا۔

میں واپس کمرے میں آ گئی تو کسی نے باہر کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ ''اس وقت کون آ گیا ہے۔'' میری ماں کچھ چڑ کر بولی۔ ''میں نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو وہ دونوں سپاہی کھڑے تھے، کہنے لگے ''یوں تو آپ کے گھر کی تلاشی لینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہمارے کتے وہاں باہر گرے ہوئے خون کی سونگھ کر بار بار یہاں آ جاتے ہیں ذرا اندر سے دیکھنے دو۔

میں بہت گھبرا گئی کہا۔ ''ماں رات بھر سوئی نہیں۔ ابھی کھانا کھا کر آنکھ لگی ہے۔ آپ گھنٹے بھر تک ......''

''کوئی بات نہیں۔ سونے دو ماں جی کو۔ ہم گھنٹے تک آ جائیں گے، لیکن رات کو۔''

''لیکن رات کی کوئی بات نہیں۔'' اور میں نے انہیں بھیج دیا۔

''کون تھا؟'' ماں نے پوچھا۔

''سپاہی تھے۔ کہہ رہے تھے تلاشی لینی ہے۔ کوئی بھاگ کر اس گلی میں آ چھپا ہے۔''

''کنڈی اچھی طرح سے لگا دی ہے۔ ماں نے پوچھا اور چارپائی پر لیٹ گئی۔

کچھ دیر بعد میں دھیرے سے پچھلی کوٹھری میں گئی۔

اس نے بھی شاید باہر کی کنڈی کی آواز سن لی تھی۔ بیہوشی میں ہی کنڈی کی آواز کیسے سن لی اس نے یہ میں آج تک نہیں سمجھ پائی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ ایک بدحواس خوف تھا اس کے چہرے پر۔ ''کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''پولیس۔ تلاشی لینے آئے تھے۔ پھر آئیں گے گھنٹہ بھر تک۔'' میں ساری باتیں جلدی جلدی بتا کر بری الذمہ ہونا چاہتی تھی۔

اس کے چہرے پر کوئی فیصلہ آیا۔ پختہ فیصلہ۔ بیٹیوں کو پکڑ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جاتا ہوں۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔

میں نے بھی اسے روکا نہیں۔ روک کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ شاید اسے بھی اور مجھے بھی پتہ تھا کہ اب کوئی بچاؤ نہیں۔ بچاؤ کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ باہر کا خطرہ دہلیز پھاند کر اندر آ گیا تھا۔

لڑکھڑاتے ہوئے اس نے ایک قدم اُٹھایا پھر دوسرا اور پھر کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ پچھلا

دروازہ میں نے کھول دیا۔ اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی پرچھائیں تھی۔ جینے کی خواہش تھی، احسان مندی تھی اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

میں بتا نہیں سکتی کیونکہ مجھے حروف جوڑنے آتے ہیں نہ میں زیادہ پڑھی لکھی ہوں، لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب کچھ برسوں تک میرے آس پاس منڈلاتا رہے گا۔ اور خالی لمحوں میں رہ رہ کر میرے پاس لوٹ آئے گا۔

وہ باہر نکل گیا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگالی اور آہٹ لیتی ہوئی وہاں کھڑی رہی۔

ایک دم بہت سے کتے بھونکے۔ گولیوں کی آواز مٹیالے اندھیرے میں گونجتی چلی گئی، لیکن سچ کہتی ہوں میں نے کوئی چیخ نہیں سنی۔

باہر سے صرف کتوں کے بھونکنے کی اور بوٹوں کے دوڑنے کی آواز آرہی تھی۔ تب ہی گولیوں کی آواز سے اور دگڑ دگڑ کی آواز سے میری ماں شاید نیم خواب اور نیم بے خوابی کی دہلیز سے چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کے دروازے کی طرف دوڑتی ہوئی چیخنے لگی۔ ''نہ مارو میرے بچے کو، نہ مارو میرے کیول کو، نہ گولیاں مارو میرے بچے کو۔

○○

سورج چڑیاں اور ربّ

میرے دادا بہت سویرے اُٹھتے ،منہ اندھیرے،رات کے پچھلے پہر جب اندھیرے میں دُودھیا روشنی کی ہلکی چھینٹ گھلنے لگتی ہے۔

سردی ہو یا گرمی وہ سدا ٹھنڈے پانی سے نہاتے۔نہا کر خوش ہوتے رہتے۔دھیمے سُروں میں کچھ گاتے رہتے۔شاید گروبانی کی کوئی لائن۔

صبح تڑکے نہاتے،پھر دوپہر کی روٹی کھانے سے پہلے پھر شام کو گردوارے جانے سے پہلے۔

جب بھی خوش ہوتے کھلکھلا کر ہنستے۔اکیلے بیٹھے ہنستے چلے جاتے۔نہاتے ہوئے،ہنستے پڑھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگتے اور ہنس دیتے۔

صبح سویرے وہ نہا کر سیدھے گروگرنتھ صاحب کے کمرے میں جاتے،روشنی کرتے اور پھر پاٹھ کرنے لگتے۔پاٹھ کرتے کرتے آنکھیں بند کر لیتے،ان کے ہونٹوں پر ہنسی ہوتی۔بے آواز ہاتھوں سے جیسے وہ رقص کا انداز بناتے رہتے آنکھیں بند ہونٹوں پر کھلتی ہوئی ہنسی ہاتھ ناچتے ہوئے اور سامنے گروگرنتھ صاحب کے کھلے اوراق۔

یہ میرے بچپن کا سب سے عجیب منظر تھا جو پھر میں نے کبھی کہیں بھی نہیں دیکھا۔

آج بھی یاد کرتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے۔کیسی طلسمی دُنیا میں رہتے تھے میرے دادا جی۔ ان کے اندر کیسے ایک پوری کائنات آباد تھی۔اُنھوں نے خود ہی اس کی تخلیق کی تھی اور اپنے سر جی اس کائنات کی وہ کسی بادشاہ کی طرح نظرثانی کرتے تھے۔ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑاتے تھے۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک پا کر وہ ہنس دیتے تھے۔

ایک عجیب دُنیا۔

جادو بھری! طلسمی!

کبھی کبھی پاٹھ کرتے ہوئے رُک کر وہ سورج کی طرف دیکھنے لگتے۔سورج سیدھا

گروگرنتھ صاحب کے کمرے کے باہر چڑھتا تھا۔آسمان کے تھال میں گھی کے بڑا عظیم سالہبہ لہبہ اُجالا کرتا۔

وہ سورج کو دیکھتے اور ہنسنے لگتے۔ سورج سے باتیں کرنے لگتے، آہستہ آہستہ جیسے کوئی محبوب سے سرگوشیاں کرتا ہے۔

رب سے بھی اسی طرح سرگوشیاں کرتے رہتے۔ دھیمے دھیمے ہنستے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہتے جیسے کسی ہمراز دوست سے باتیں کررہے ہوں۔ ایک اکیلے کمرے میں ایک اکیلے انسان کو اکیلے بیٹھے اس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے سننا دھیمے دھیمے ہنستے ہوئے دیکھنا عجیب وغریب احساس تھا دوسری دُنیا کو جس کی خبر تب نہیں تھی۔ اب تو بالکل ہی نہیں رہی کیونکہ ہم بڑے ہوکر احساس کی دُنیا سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ویسے تب بچپن کے اس معصوم بھولے پن میں کبھی کبھی دُھندلا احساس ہوتا تھا کہ اس راز کو تو میں سمجھ سکتی ہوں۔ کئی چیزیں سمجھ نہیں بھی آتیں پھر بھی ان کے اندر چھپی ہوئی چیز سمجھ میں آتی ہے۔ دُھندلی سی۔ جبھی اس وقت کو لفظوں میں پکڑ پانا ممکن ہوتا ہے۔ بچپن کا یہی تو کرشمہ ہوتا ہے۔ نہیں؟ یہ عجیب وغریب انسان تھے۔ میں ان کو دیکھتی تو حیران ہوتی، چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی اُنھیں۔

گھر میں اور کسی کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، دادی کو بھی نہیں۔ پتا جی نے ان دونوں کو گھر کا ایک حصہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ گروگرنتھ صاحب کا کمرہ اوپر چھت پر بنوا دیا تھا کیونکہ دادا جی جنھیں ہم ''بھیا جی'' کہتے تھے یہی چاہتے تھے بھیا جی کا خود کا ایک کمرہ بھی اوپر چھت پر ہی تھا۔ گروگرنتھ صاحب کے کمرے کے ساتھ ملحقہ۔ چاہے دادا دادی جی کا رہنے والا حصہ دوسری چھت پر تھا لیکن دادا جی اپنا زیادہ وقت اپنے چھت والے کمرے میں ہی گذارتے تھے۔ اوپر کے دونوں کمروں میں سے ایک میں ان کو سدا ڈھونڈا جا سکتا تھا یعنی اگر وہ گھر میں ہوں تو۔

پتا جی نے اُنھیں رہنے کے لیے مکان، کھانے کے لیے روٹی، پہننے کے لیے کپڑے اور پاٹھ کرنے کے لیے چھت والے دونوں کمرے دے رکھے تھے۔ ایک پاٹھ کرنے کے لیے اور ایک پاٹھ کے بعد آرام کرنے کے لیے اور جیب خرچ کے لیے الگ سے کافی تھا، نہیں؟۔ وہ اپنے فرضوں سے چھٹی پا گئے تھے ''اور بزرگوں کو ضرورت بھی کیا رہتی ہے۔'' پتا جی سوچتے ہوں گے۔

میری ماں ان دونوں کو یعنی دادا دادی کو دو وقت روٹی پکا کر کھلاتیں۔ صبح اور شام چائے

ناشتہ، لسی اور مکھن سب دیتیں۔ بیمار ہوں تو وقت پر دوا کھلاتیں۔ دادی کے سر میں تیل لگا دیتیں وہ سمجھتیں کہ اپنے ساس سسر کی بڑی خدمت کر رہی ہیں۔ ''اور بزرگوں کو چاہیے بھی کیا۔'' وہ سوچتی ہوں گی۔

لیکن میں نے دادا جی کو کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا نہ ہی دادی کو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ 'کیا کھائیں گے؟' 'روٹی کھالیں'، 'لسی؟' 'دودھ؟' 'درزی کو ناپ دے دیں'، 'سبزی اور لاؤ' کے علاوہ ان سے اور کوئی بات کرتا ہی نہیں تھا۔ یہ ایک لفظی بات بھی اکثر ماں ہی کیا کرتیں۔

دادی تو اپنے دل کی اندھیری گپھا میں اتر گئی تھیں۔ شاید اور دادا جی نے باتیں کرنے کے لیے دربار صاحب کے کمرے میں رب کو، آسمان میں سورج کو اور چھت کے کھلے آنگن میں چڑیوں کو پالیا تھا۔ بہت سال پہلے ''بھیرا'' میں رہتے تھے۔ سرگودھا کا ایک شہر جو اب پاکستان میں ہے، وہاں ان کے دادا پردادا کے وقت کا کوئی پشتینی بیوپار تھا۔ بنی بنائی ساکھ پشتوں سے۔

میرے پردادا کے گھر صرف ایک ہی بچہ پیدا ہوا۔ میرے دادا جی کی ہر نسل میں صرف ایک ہی لڑکا پیدا ہوا کرتا تھا اس خاندان میں جو عام طور پر اکلوتا بچہ بھی ہوتا تھا۔ اور وہ بیوپار، چلا چلایا پشتوں سے جس کی ساکھ نے گہری جڑیں پھیلا رکھی تھیں باپ سے بیٹے تک چلا آتا تھا۔

مگر میرے دادا جی کے گھر دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک میرے پتا جی اور دوسرا ان کا چھوٹا بھائی جس کا نام مجھے معلوم نہیں کیونکہ ان کا نام گھر میں کوئی لیتا ہی نہیں تھا۔

میرے پتا جی نے کہا وہ تجارت نہیں کریں گے، وہ تو ڈاکٹر بنیں گے، تو وہ امرتسر آ گئے۔ ساتھ میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی لے آئے۔ بولے تو بھی پڑھ اور ڈاکٹر بن۔ پشتینی چلے چلاتے بیوپار میں کیا رکھا ہے، نہ کوئی چیلنج نہ اپنی عقل استعمال کرنے کا موقع۔

دونوں بھائی امرتسر میں پڑھتے رہے اور پھر وہیں میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ وہیں پتا جی کے چھوٹے بھائی فوت ہو گئے۔

پتا جی نے جب لاہور میں اپنی پریکٹس شروع کی دادا جی ایک دن اچانک لاہور آ پہنچے۔ دادی ان کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں، ان کے ساتھ لوہے کی ایک صندوقچی تھی جس کا رنگ ہرا تھا اور پھول بوٹے منقش تھے۔

لاہور پہنچتے ہی دادی دہاڑ مار کر پتا جی سے لپٹ گئیں۔ ''سب کچھ تباہ کر آئے ہیں یہ۔ سب کچھ لٹا دیا انھوں نے۔ دکان بھی بیچ آئے ہیں۔ گھر کو تالا لگا آئے ہیں۔''

''کیوں، کیسے؟'' پتا جی اتنے حیران تھے کہ انھیں کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا جیسے۔ دادا جی لا

پرواہی سے ہنس پڑے۔ ''تجھے تو تجارت کرنا نہیں تھا۔ پھر اس سب کو سنبھال کر کرنا بھی کیا تھا۔ منت کا سر درد۔ جی کا جنجال۔''

دادا جی اور دادی کو ایک بڑا سا کمرہ دے دیا گیا لیکن دادی ہر وقت ان کو گھورتی رہتیں وہ جیسے کو بھول نہیں پائی تھیں وہاں ان کی جڑیں تھیں جنھیں دادا جی اُکھاڑ کر لاہور لے آئے تھے۔

کچھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ دادا جی نے اپنی چارپائی اوپر چھت کے کمرے میں بچھالی۔ اس کمرے کے آگے کھلی چھت تھی اور عین سامنے سے سورج اُگتا تھا۔

گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ پہلے نیچے ہی ایک کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ پتا جی کو دن رات کہہ کہہ کر انھوں نے چھت پر ہی ایک کمرہ بنوا لیا۔ اپنے کمرے کے ساتھ بالکل لگا ہوا، اور گرو گرنتھ صاحب کو اسی کمرے میں لے گئے۔ کہنے لگے یہاں کتنی کھلی چھت ہے، کیسی اُجلی دھوپ ہے، کتنی کھلی ہوا ہے۔ بابا جی بھی اوپر ہی رہیں گے میرے ساتھ والے کمرے میں۔

جب بھی دادی ان کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے کی بات کر کے بسورنے لگتیں تو ڈانٹ دیتے۔ ''وہ تو اپنا تھا ہی نہیں، غلطی سے آ گیا تھا۔ ہمارے گھر مسافر تھا، چلا گیا۔ تم ہی بتاؤ کبھی ہمارے خاندان میں کسی کے گھر ایک سے زیادہ بیٹا پیدا ہوا ہے، اور وہ ایک بیٹا موجود ہے تیرے پاس، دوسرا تو بھولا بھٹکا آ گیا تھا۔ چلا گیا۔ اور اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُوپر چلے جاتے۔ چھت پر دربار صاحب کے کمرے میں پاٹھ کرتے اور پھر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیتے۔ ہنستے رہتے سرگوشیاں سی کرتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں دھیمے دھیمے جیسے کسی معشوق سے کرتا ہے کوئی۔

کبھی وہ آنکھیں بند کر کے ہنستے اور باتیں کرتے۔ کبھی سورج کی طرف دیکھ کر ہنستے اور باتیں کرتے۔

مجھے لگتا ہے ان کی داڑھی کے بال اسی لیے سفید تھے، کیونکہ ان کی سورج سے دوستی تھی، سورج اپنی تمام اُجلی روشنی کے رنگ لیے ان کی داڑھی میں آ بیٹھا تھا۔

میں پوچھتی ''بھیا جی، آپ کس سے باتیں کرتے رہتے ہیں؟'' کہتے ''کسی سے بھی تو نہیں۔'' اور سنجیدہ ہو جاتے۔

انھیں شاید لگتا ہوگا کہ میں بھی اسی گھر کا ایک حصہ ہوں، ان کے بیٹے کے گھر کا حصہ جہاں ان کی بات کوئی نہیں سمجھتا، سب ہی کہتے تھے۔ ''بھیا جی کا کیا، نہ انھیں کسی کی فکر فاقہ، نہ کسی کی پریشانی نہ کام، نہ دھندا، موج اُڑاتے ہیں موج۔'' اور تو اور میری دادی بھی یہی کہتی تھیں، کئی بار لڑتیں ان کو کوستیں، انھیں طعنے دیتیں، پرانی باتوں کے طعنے گزرے زمانے کی

ٹہنیوں کے کونے و دسر نیچا کیے سنتے رہتے، کیونکہ دادی کی یہ مہابھارت کتھا عام طور پر تب ہی شروع ہوتی تھی جب دادا جی روٹی کھا رہے ہوں۔ مجھے تو لگتا جیسے دادی انھیں اس طرح اطمینان سے روٹی کھاتے دیکھ کر چڑ جاتی تھیں۔ وہ سنتے رہتے اور جلدی جلدی روٹی کھاتے رہتے تاکہ یہ مشکل وقت جھٹ سے گزر جائے اور وہ وہاں سے کھسک لیں۔

روٹی ختم کرکے وہ اپنی تھالی، کٹوریاں اور لسی کا خالی گلاس جھوٹے برتنوں میں ڈال دیتے۔ چڑیوں کے لیے بچائی روٹی ہتھیلی میں دبائے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ اوپر کی چھت، چھت پر بنے دونوں کمرے سورج اور چڑیاں، یہی ان کی دنیا تھی جہاں وہ اکیلے نہیں تھے۔ یہی ان کا خاندان بھی یہی ان کا سہارا بھی تھا۔

چڑیوں کے لیے بچائی ہوئی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے جاتے اور کھلی چھت پر بکھراتے جاتے۔ چڑیاں ان کے آس پاس بیٹھ کر روٹی کے ٹکڑے چگنے لگتیں، اُڑتیں اور پھر بیٹھ جاتیں۔ بیٹھے بیٹھے پھدکتیں، ان کی ننھی دُموں کے نرم پروں سے لے کر ان کے دھوپ میں چمکتے پروں کے ریشے ریشے میں سے عجیب لرزشیں سی گزرتیں، کپکپاتی ہوئی لہریں سی اور دادا جی ہنستے رہتے چڑیوں سے بھی باتیں کرتے تھے وہ۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ تمام راز کی باتیں۔

مجھے لگتا ہے چڑیوں سے ان کی بہت گہری دوستی تھی تب ہی تو ان کا بدن بھی چڑیوں جیسا ننھا سا اور ہلکا پھلکا تھا۔ بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ جاتے چھوٹے چھوٹے قدموں پر بھاگتے ہوئے گرودوارے چلے جاتے۔ ان کے ساتھ چلو تو دوڑنی لگانی پڑتی تھی، ان کے کمرے کی شاید ایک صدی سے صفائی نہیں ہوئی تھی، یہی کہتے تھے پتا جی کہ پورے سو سال سے پتا جی نے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کروائی ویسے ان کو لاہور آئے زیادہ سال نہیں گزرے تھے۔

گھر میں جب بھی پتائی رنگ روغن ہوتا تو پتا جی بہت ناراض ہوتے۔ دادا جی اپنے کمرے میں پتائی والے کو گھسنے ہی نہیں دیتے تھے نہ دروازوں پر رنگ روغن نہ دیواروں پر قلعی۔ جب فرش پر جھاڑو ہی نہیں لگانے دیتے تھے کسی کو تو دیواروں بیچاریوں کی بساط ہی کیا تھی۔

پتا جی ناراض ہوتے ڈانٹتے رہتے۔ دادا جی چپ چاپ سنتے رہتے اور پھر سب کی آنکھ بچا کر اپنے کمرے کو تالا لگاتے اور غائب ہو جاتے۔ گورودوارے چلے جاتے ہوں گے، یا لارنس گارڈن یا نہر پر، کون جانے۔

سارا دن غائب رہ کر رات کو گھر لوٹ آتے۔ سارے دن کی اکٹھی ہوئی سورج کی روشنی

ان کی داڑھی میں چھپی بیٹھی ہوتی اور کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ مجھ ہی کو وہ نظر آتی تھی۔ یہ میرا اور دادا جی کا مشترکہ راز تھا۔

آتے اور گرو گرنتھ صاحب کے کمرے میں جا کر پاٹھ کرنے لگتے۔ پاٹھ کرتے کرتے ہنستے رہتے چھوٹی چھوٹی باتیں جیسے پورے دن کی کتھا کہہ رہے ہوں، کہاں گئے کیا دیکھا کیا کھایا، یا کہاں چھپے رہے سب۔ بتایا نہ میں نے ان کی دوستی رب سے بھی، ویسے ہی تھی جیسی سورج سے اور چڑیوں سے۔

میں پوچھتی ''بھیا جی آپ اپنے کمرے کی صفائی کیوں نہیں ہونے دیتے؟ پتا جی بہت غصہ ہو رہے تھے۔'' چپ رہتے وہ۔

لیکن ایک دفعہ صرف ایک بار شاید بہت لاڈ آیا تھا انھیں مجھ پر اور بولے تھے ''آ تجھے دکھاؤں'' اور انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں چوہوں کے بل دکھائے چھت کے کونوں میں باریک ریشم کی اوڑھنیاں بنتی مکڑیاں۔ کمرے کے روشندان میں کبوتروں کے گھونسلے، پنکھے کے خول میں گوریوں کے گھونسلوں میں چھپے انڈے دکھائے اور دھیمے دھیمے راز دارانہ انداز میں بولے۔ ''تو یہ بیچارے کہاں جائیں گے۔''

۱۰۳ سال وہ زندہ رہے۔ اسی طرح پوری صدی وہ اپنے ہی دانتوں سے روٹی کھاتے رہے اور چشمہ کے بغیر پنجابی اور اردو اخبار اور رسالے پڑھتے رہے۔ پاٹھ کرتے رہے۔

مرنے سے پہلے بس دو چار دن بیمار ہوئے نہ دوائی کھائی نہ دودھ پیا۔ کہنے لگے ''بس اپنا اسٹیشن آنے والا ہے، گاڑی سے اترنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تو بکھرا ہوا سامان سمیٹنا ہے بس۔''

جس دن ان کی موت ہوئی اس دن سورج سویرے اپنے پورے جاہ و جلال سے چڑھا تھا وہ اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سورج کی طرف دیکھ کر بولے ''یار آج تو میں نہایا بھی نہیں'' اور زور سے ہنس پڑے اور پیچھے کی طرف چارپائی پر لڑھک گئے۔ میں زور سے چیخی ''پتا جی بھیا جی کو دیکھو بھیا جی'' پتا جی بھاگے آئے نبض دیکھی پھر ان کو سیدھے لٹا دیا۔ وہ ابھی بھی ہنس رہے تھے اور ان کا منہ سورج کی طرف تھا۔

آپ مانیں گے تو نہیں لیکن سچ کہتی ہوں میں نے خود دیکھا صاف صاف دادا جی سورج سے گلے مل کر ہنس رہے تھے اور سفید داڑھی والا سورج ان کو اپنی چمکتی بانہوں کی آغوش میں لپیٹ رہا تھا۔

○○

کالے کنویں

اندھیرا تارکول کی طرح گاڑھا اور چپچپا تھا۔ لگتا تھا دو قدموں کے بعد اندھیرا اور بھی بھیانک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان پھیلا سیاہ کالا کیچڑ جس میں بس ہم دھنسے رہ جائیں گے۔ ایک بھیانک دلدل ہم کو نگل جائے گی، اور ایک چیخ کا چیتھڑا بھی اس سونے پن میں پھڑ پھڑانے کو نہیں بچے گا۔

اس بھیانک سونے پن میں اور کالی اندھیری خاموشی میں ہمارے گڈے کے پہیوں کا ذرہ ذرہ زمین سے آسمان تک پھیلتا لگ رہا تھا، ویسے آسمان تھا ہی کہاں؟ اندھیرے کا سیاہ کبوتر جو ہمارے سروں سے شروع ہو کر کسی بے نام لا متناہی فاصلے تک پھیلا ہوا تھا۔

وقت؟ وقت کہاں تھا؟ وہ تو اس اندھیری سیاہی کی دلدل میں ہی پھنسا لگتا تھا۔ سورج؟ سورج کو تو کسی نے شاید اندھیری مٹی میں دفنا دیا تھا۔ نہ سورج نہ روشنی نہ چاند نہ تارے نہ ہوا نہ کائنات نہ پیڑ نہ کوئی پرندہ۔ جنگلی جانور وہ تو ضرور ہوں گے ہی، کیونکہ کالے گاڑھے اندھیرے میں کبھی کبھی پیلی خونخوار آنکھیں ہماری طرف گھور کر دیکھتی سی لگتی تھیں اور ایسے وقت میں ہمارے گڈے کے پہیے کی منحوس کرڑ کرڑ بڑی محفوظ لگتی تھی، ایسا احساس ہوتا تھا شاید پہیے کے منحوس شور سے ڈر کر ہی وہ جنگلی جانور ہمیں پھاڑ کر کھا جانے میں آنا کانی کر رہے ہوں۔ یہ شور نہ ہوتا تو شاید اب تک ہماری بوٹیاں ان کے پیٹوں میں پہنچ چکی ہوتیں اور ہماری ہڈیوں کو نکیلے آروں کی طرح ان کے دانت چبا رہے ہوتے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں بس یہی لگتا تھا کہ گڈا دھیرے دھیرے چل رہا ہے، کس سمت کو اس کا کوئی پتہ نہیں تھا، ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ اس کی خبر ہم میں سے کسی کو نہ تھی، کرڑ کرڑ سن کر ہم سب نے اندھیرے کی دلدل میں سے ہاتھ اُبھارے تھے اور گڈے کی بانہہ کو پکڑ کر اپنے آپ کو بوریوں کی طرح اُچکا کر اس میں پھینک دیا تھا۔ اندھیرے کی دلدل میں دھنسے رہنے سے تو اچھا ہے کہ ہم کسی چلتی ہوئی چیز میں بیٹھ جائیں۔ کھڑے رہنے سے اور

آہستہ آہستہ اندھیرے کی قید میں دفن ہو جانے سے تو یہ گڈا محفوظ تھا۔ آخر چل تو رہا ہی تھا، ورنہ پہیوں کا شور کیسے ہوتا اور ہچکولے کیوں آتے۔

لیکن گڈے میں اتنی دیر بیٹھے رہنے سے شک ہونے لگا تھا کہ ہم چل بھی رہے ہیں یا نہیں۔ گڈے کے پہیوں کا یہ شور اور یہ ہچکولے کہیں اندھیرے کا بنا ہوا شک کا جال تو نہیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں سے ہاتھ گڈے کی بانہہ کو پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن ہم گڈے میں اتنے لوگ تھے کہ ہمارے گھٹنے ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا رہے تھے۔ ہماری کہنیاں ایک دوسرے سے سٹی ایک دوسرے کو چبھ رہی تھیں اور ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی بو اور گرمی محسوس کر رہے تھے۔ اگر اور لوگ گڈے میں چڑھ آئیں تو بیٹھیں گے کہاں ہمارے لیے تو سانس لینے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔

ویسے یہ تھا تو گڈا ہی بہشت کا ٹکڑا نہیں تھا، لیکن حضرت نوح کی کشتی کی طرح اندھیرے کے اس سمندر میں سے نکال کر لے جانے کی یہ ہماری واحد امید تھی۔ اس لیے جس وقت اندھیرے میں سے نادیدہ ہاتھ ہمارے پاس کے جنگلے کی کھڑکی کو پکڑنے لگتے تو ہم پوری طاقت سے ان انگلیوں کی کسی ہوئی مٹھی کھول کر ان ہاتھوں کو اندھیرے کے سیلاب میں واپس دھکیل دیتے۔

کئی ہاتھ ایسے بھی تھے جن کی پکڑ بڑی سخت اور ٹھوس ہوتی۔ لاکھ زور لگانے پر بھی ان کی مٹھی گڈے کی باہی چول سے نہ ہلتی۔ پھر ہم اپنی جیبوں میں سے چاقو نکالتے اور لکڑی کے گرد کسی ان انگلیوں کو ایک ہی جھٹکے سے کاٹ دیتے۔ اندھیرے کے سیلاب میں ایک بھیانک چیخ ابھرتی جیسے آسمان میں اڑتے عقاب کو گولی لگی ہو۔ اور وہ چیختا ہوا چکراتا ہوا لڑکھڑاتا اپنی ٹوٹی اڑان اور ٹکڑے ٹکڑے بکھرتے پروں سمیت نیچے زمین کی طرف گر رہا ہو۔

لیکن یہاں سیاہ کالے اندھیرے میں نہ انسان نظر آ رہا تھا نہ ٹوٹی اڑان والا عقاب صرف ایک لمبی خوفناک درندے کی چیخ اندھیرے کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تیز خنجر کی طرح کاٹتی چلی جاتی تھی اور ہمارے ہاتھوں میں کئی انگلیوں کے ٹکڑے رہ جاتے تھے جن کی چپچپاہٹ سے ہم اندازہ لگا لیتے تھے کہ شاید ان میں سے خون ہی رس رہا ہوگا۔

ویسے اس اندھیرے میں نہ گوشت کا گندمی رنگ تھا نہ خون کا سرخ رنگ سب کچھ کالا تھا۔ کالا اور چپچپا۔

اچانک گڈے میں سے ایک بچے کے آہستہ آہستہ سسکنے کی آواز آنے لگی تو کیا اس گڈے میں کوئی بچہ بھی تھا؟

یہ کیسا اندھیرا تھا جس میں نہ حیرانی نہ ہمدردی۔ نہ اپنی طرح کے اور لوگوں کے ہم سفر ہونے کی یقین دہانی تھی نہ تنہائی کی بوکھلاہٹ نہ غم نہ اداسی نہ ہی کوئی بول رہا تھا ہم سب کے گلے میں اندھیرے اور خوف کی چپچپاہٹ تھی بس۔

بچہ رہ رہ کر مسکرا اٹھتا تھا۔ ہچکی کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ایک خوفزدہ سرگوشی۔ اس کی ماں اسے چپ کیوں نہیں کرواتی، اسے بہلاتی کیوں نہیں، ماں اس کی ماں اس گڈے میں ہے بھی کہ نہیں کون جانے۔

اندھیرا — گڈے کے پہیوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ جیسے کوئی موت کی آخری ہچکی سے پہلے کراہ رہا ہو۔

اچانک مجھے لگا کہ میرے کندھے کو کسی ننھی سی ہتھیلی نے پکڑا ہو، سہارے کے لیے میرے گال پر اس کے سسکنے کے لمس کا احساس ہوا۔ پھر دو چھوٹی چھوٹی ٹانگیں میری ٹانگوں سے رگڑتی ہوئی لڑکھڑاتی سی گزرنے لگیں۔ لگا کہ کوئی بچہ گڈے میں اِدھر سے اُدھر چل رہا ہے، سُبکتا لڑکھڑاتا، لوگوں کی سکڑی سمٹی ٹانگوں بانہوں میں سے اور اندھیرے میں جمے جسموں میں سے راہ بناتا۔ ٹٹول ٹٹول کر لوگوں کے کندھے ڈھونڈتا اگلا قدم اٹھانے کے لیے سہارا لیتا۔

شاید اپنی ماں کو تلاش کر رہا ہوگا میں نے سوچا۔

اچانک دور اندھیرے میں کچھ آنکھیں چمکیں اس طرف جدھر ہمارا گڈا لڑھکتا ہوا جا رہا تھا، عجیب تھی وہ آنکھیں اندھیرے میں برمی سے سوراخ کرتی پیلی وحشی روشنی سے۔ جلتی بجھتی روشنی بھی کا ہے کی جیسے کوئی ادھ مرے جگنو ہوں۔

میں نے اس پیلی ادھ مری روشنی میں اپنے ساتھیوں کی قد و قامت تلاش کرنے کی کوشش کی۔

ماں۔ آں۔ آں

کسی بچہ کی لمبی چیخ۔ ماں، آں، آں۔ ایک التجا کرتی ہوئی پکار، اندھیرے کی تھاہ میں زخمی پرندے کی طرح تڑپتی ہوئی پھٹے چیتھڑے کی طرح بونڈر میں پھڑ پھڑاتی۔ اندھیرے کی دلدل میں خنجر چبھوتی۔

بچہ چیخ رہا تھا۔ زور زور سے چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں، اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔

''کس کی آنکھیں؟'' اندھیرے میں سے کسی نے پوچھا۔

''وہ جو گڈا چلا رہا ہے اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ صرف گڑھے، ماتھے کے نیچے دو گڑھے

ہیں۔'' بچہ دہشت میں چیختا ہوا بول رہا تھا، ہلکورے لے لے کر عجب خوف کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی اس کی آواز۔ اندھیرے کی سیاہی کو کھروچتی ہوئی اس کی چیخ سنائی دی۔ اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ ماتھے کے نیچے دو گڑھے۔ ہڈیوں میں کھدے ہوئے دو گڑھے اتنے گہرے۔ کنوؤں جیسے۔ کالے کنوئیں۔ آنکھیں نہیں کالے کنوئیں۔

OO

آگ کے پھول

''تم بول کہاں سے رہی ہو؟''

منسکھانی کی آواز کانپ رہی تھی ٹیلی فون کے چونگے پر اس نے ہتھیلی کچھ اس طرح لپیٹ لی کہ اس کی آواز کمرے میں بیٹھی کسی چڑیا تک کو سنائی نہ دے۔

''کہاں سے بول رہی ہو تم؟ چڑیل، بے شرم، تمھاری ہمت کیسے ہوئی۔''

چھوٹے سے کمرے میں ایک کونے میں بیٹھی مس پرکاش ویسے تو ہمیشہ کی طرح اپنے سامنے بہی کھاتے کھولے بیٹھی تھی لیکن منسکھانی کا ایک ایک لفظ سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے کان ہی نہیں پورا بدن انٹینا بن گیا تھا۔ اسٹیل کی لمبی بانہیں پھیلی ہوئی، تنی ہوئی ہر لفظ پکڑنے کے لیے، سننے کے لیے، سن کر جذب کر لینے کے لیے بیتاب آنکھیں جس پر جھکی ہوئی عینک کے پیچھے سے رجسٹر پر لکھے بے حساب ہندسوں کو گھورتی ہوئی، لیکن وہ کسی بھی ہندسے کو دیکھ نہیں رہی تھیں وہ صرف سن رہی تھیں۔

''تم فوراً ہوسٹل آؤ۔ فوراً سمجھ گئیں؟ اور اپنے ساتھ اس حرامزادے کو بھی لے آؤ۔ میں بھی دیکھوں اس کی ہمت کیسے ہوئی تجھے پھسلانے کی، میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔ میں تیری ٹانگیں توڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی۔ جا، لے جا، ان ہی ٹانگوں میں ہی اٹکی ہے نہ تیری جان۔ لے جا ان کو۔''

منسکھانی کا سارا جسم آندھی میں کے گھرے پیڑ کی طرح کانپ رہا تھا، جس ہاتھ سے ٹیلی فون پکڑا ہوا تھا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پتے کی طرح، تیز آندھی میں تھرتھراتے پتے کی طرح۔ منسکھانی کے کٹے ہوئے بال غصہ میں تھوڑا تھوڑا کھڑے ہو گئے تھے۔ خطرہ سونگھتے کتے کے کانوں کی طرح۔ اس کے کان میں ہیرے کے ٹاپس لرز رہے تھے۔ لال مرچ کی طرح سرخ ہوا ٹھے تھے۔ گال انگارے کی طرح دھدک رہے تھے۔

''فوراً''

اور اُدھر راج نے فون رکھ دیا۔ بکی بکی منسکھانی ٹیلی فون کا رسیور پکڑے کچھ دیر کھڑی

رہی اور پھر جیسے ہوش میں آ کر ریسیور پٹک دیا۔ انگارا اُگلتی آنکھوں سے پرکاش کو گھور کر ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ ''مسز ملہوترا کہاں ہیں؟''

پرکاش نے بڑی معصوم سی صورت بنا کر اور انجان بن کر کہا۔ ''اپنے کمرے کی طرف گئی تھیں، شاید وہیں ہوں'' منسکھانی پیر پٹختی ہوئی گویا زمین توڑ دے گی، گویا اپنے کُھروں سے اس بنجر زمین کو روند دے گی، مسز ملہوترا کے کمرے کی طرف چل دی۔

مسز ملہوترا لڑکیوں کے اس ہوسٹل کی وارڈن تھیں۔

ہوسٹل کا نام تھا کام کاجی لڑکیوں کا ہوسٹل۔ اس میں عورتیں ہی رہتی تھیں لڑکیاں تو کبھی کبھار ہی ہوتی تھیں جیسے راج۔

وارڈن کے لیے بنے دو کمرے کے ایک فلیٹ میں مسز ملہوترا اپنی تین بیٹیوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ ہوسٹل میں رہنے والی کافی عورتیں یا تو ایک کمرہ لیتیں یا دو عورتیں ایک کمرے میں مقیم ہوتیں۔

ساری عورتیں مسز ملہوترا سے حسد کرتیں کیونکہ ''کام کاجی عورتیں'' کی اس دنیا میں اکیلی مسز ملہوترا ہی تھیں جو گھر گرہستی جمائے خاندان کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ پورے ہوسٹل میں صرف سات مرد تھے ایک مسٹر ملہوترا، ایک درزی دو باورچی اور تین چوکیدار جن کی ڈیوٹی آٹھ آٹھ گھنٹے بعد بدلتی تھی۔

مس منسکھانی نے مسز ملہوترا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا، مسٹر ملہوترا نے باہر جھانک کر دیکھا اور واپس مڑ گئے۔ دو ایک منٹ بعد مسز ملہوترا اپنی جمائی کو ہتھیلی سے چھپاتی ہوئی باہر آئیں۔

تھوڑی دیر تک نہ تو وہ کچھ بولیں اور نہ منسکھانی۔ منسکھانی کے گلے میں غصہ سے کانٹے اگ آئے تھے اور اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''واٹ از دی پرابلم'' مسز ملہوترا نے روکھی آواز میں پوچھا۔

''مجھے راج کی رپورٹ کرنی ہے۔'' منسکھانی نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔ مسز ملہوترا کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ منسکھانی نے وہ پھڑ پھڑاتی مسکراہٹ دیکھ لی۔ اسے لگا اس وقت وہ اس عورت کا خون کر سکتی ہے۔

''ہاں بتائیے۔'' مسز ملہوترا نے مسکراہٹ کی پھڑ پھڑاہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ چہرے کو نقاب سے ڈھکنے کی بیکار سی کوشش۔ لیکن اس کی آواز نے جو اوب سی تھی وہ اُسے پونچھ نہ سکی۔

منسکھانی کچھ دیر چپ رہی ''چڑیل'' اس نے دل ہی دل میں مسز ملہوترا کو گالی دی پھر الفاظ کو چباتے ہوئی بولی ''نیور مائنڈ، جب تمھیں دفتر میں بیٹھنے کا وقت ملے گا، تب سہی۔ تمھارے گھر کے دروازے پر کھڑے کھڑے میں بکواس نہیں کرسکتی۔''

اور وہ واپس مڑگئی تیز تیز چلتے ہوئے۔

''بلڈی لیز بین بیچاری لڑکی کا دم گھونٹ کر رکھ دیا ہے حرامزادی نے۔''

مسز ملہوترا نے کڑھتے ہوئے دھڑام سے دروازہ بند کیا جیسے دروازہ نہ ہو، کوئی موسل ہو۔ منسکھانی کے سر سے مار رہی ہو، منسکھانی تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک چارپائی پر راج کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بستر الٹا پلٹا پڑا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس رکھی چھوٹی سی میز پر اس کی کریم اور لپ اسٹک کی شیشیاں بکھری پڑی تھیں، اس کی چپلیں اور کتابیں سب الٹی سیدھی پڑی تھیں، کھلی الماری کے اندر اس کی شلوار قمیص اور ساڑیاں ہینگروں پر جھولتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بلاؤزوں دوپٹوں اور پیٹی کوٹ کے الٹے سیدھے ڈھیروں سے لگتا تھا جیسے کسی نے جلد بازی میں اپنی ضرورت کی چیزیں بے صبری سے کھینچ کر گھسیٹ لی ہوں۔

پہلے منسکھانی نے راج کی چپلوں کو زور سے ٹھوکر ماری جیسے وہ چپلیں نہ ہو کر اس کی پالتو بلّیاں ہوں جنھیں دکھ دے کر کے وہ راج سے اپنی ذلت کا بدلہ لے رہی ہو۔ پھر اس نے چارپائی سے اس کے کپڑے اٹھا اٹھا کر اس طرح پٹخنے شروع کیے، جیسے دھوبی پٹک پٹک کر کپڑے دھوتا ہو پتھر پر۔

بکھرے ہوئے کپڑوں سے صاف پتہ لگ رہا تھا کہ راج نے چار پانچ ڈریس پہن کر دیکھی ہوں گی۔

کتیا! شلوار قمیص پہن پہن کر شیشے کے آگے کھڑی ہو کر دیکھتی ہوگی کہ کیسی جچ رہی ہے۔ پھر اُتار کر دیکھتی ہوگی پھر ساڑی پہن کر دیکھتی ہوگی پیٹ سے ذرا سرکا کر ناف سے بھی تھوڑا نیچے سرکا کر پھر میرے دیے ہوئے گہنے پہن کر دیکھتی ہوگی اس حرامزادے کے لیے۔

منسکھانی کی آنکھوں کے آگے راج کا اگھڑا ہوا پیٹ گھوم رہا تھا۔ ناف سے تھوڑا نیچے بندھی ساڑی کانوں میں جھولتے جھمکے اور گلے میں مونگے اور موتیوں کی مالا جو منسکھانی نے اسے خود بنا کر دی تھی، پچھلے سال سالگرہ کا تحفہ۔

مالا گلے میں پہن کر وہ کس طرح منسکھانی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی تھی۔ منسکھانی نے اپنے باون سال سے تپ رہے ہونٹ اس کے چوبیس سالہ کومل ہونٹوں پر رکھ

دیے تھے۔

وہ شرما گئی اور منسکھانی کی بانہوں میں سے مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی لاڑ سے ناراض سی ہوگئی۔''کیا کرتی ہو دیدی۔''

منسکھانی کو سب کچھ یاد آ رہا تھا اور وہ سبک سبک کر رو رہی تھی۔ اپنی چارپائی پر باری سی، نڈھال بیٹھی وہ پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی۔ اپنے لیس والے رومال سے پہلے تو وہ آنسو پونچھتی رہی پھر اس نے رومال بھی دور پھینک دیا اور خود کو بے چارگی کے لامحدود طوفان کے حوالے کر دیا۔

راج نے جس طرح فون پٹکا اس کے پاس کھڑا کیلاش تھوڑا سا حیران ہوتا ہوا بولا ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''کچھ نہیں۔ یوں ہی فالتو میں سر پر چڑھی جا رہی ہے۔''

''کمال ہے! ہے تو آخر تیری روم میٹ ہی نا۔ وہ تو ایسے برتاؤ کر رہی ہے جیسے تیری ماں ہو۔''

''ماں، مائی فٹ! ماں کی طرح برتاؤ کرے تب بھی کوئی بات نہیں، لیکن وہ تو......''

''وہ تو کیا؟''

''کچھ نہیں چلو چھوڑو۔ مٹی ڈالو چڑیل پر۔ آج شام اتنی دیر بعد آئی ہے، تڑپا تڑپا کر۔ اس فضول عورت کی باتیں کر کے کیوں یہ شام برباد کریں۔ چلو اور کوئی بات کرو۔'' راج نے منسکھانی کو سچ مچ کوڑے کی طرح جھاڑ کر اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کی اس قیمتی شام کو وہ برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔

راج نے جب مانک گاؤں سے آٹھویں پاس کی تب گاؤں اسے بڑا تنگ لگنے لگا اسے اپنے باپ کی بالکل بھی یاد نہیں تھی۔ چھوٹی سی تھی وہ جب وہ ایک دوسری عورت لے آیا تھا۔ راج کے نانا نے اس کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ پنچایت کے آگے بھی معاملہ پیش ہوا تھا۔ لیکن ضدی آدمی جس بات پر اڑ جائے بھلا اسے کون روک سکتا ہے۔

ہاں قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا نانا نے۔ قانون زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ راج اور اس کی ماں کا خرچ ہی دلوا سکتا تھا نا اس کمبخت سے، لیکن نانا کو یہ منظور نہیں تھا۔ ''انھیں روٹی کی کمی نہیں۔ روٹی کھلانے لائق ہوں میں ابھی۔'' نانا نے زور سے اپنی لاٹھی کو زمین پر ٹھونک کر کہا، اور اپنی بیٹی اور نواسی کو لے کر گھر آ گیا۔ مانک گاؤں۔

راج کی ماں تب ہی سے گم سم اور نیم پاگل سی ہوگئی تھی۔ نہ کسی سے بات چیت نہ لینا نہ

دینا بس چپ چاپ روٹی پکا دیتی۔ باپ بیٹی کو کھلا کر دو ٹکڑے خود بھی کھا لیتی۔ باؤلی سی گھر میں اِدھر اُدھر پھرتی۔ راج ہمیشہ بے چین سی رہتی۔ وہ اپنی پاگل ماں سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے نانا سے بھی دور جانا چاہتی تھی۔ انھیں ننگی چارپائی پر بیٹھا لاٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے اُدھیڑ بن میں ڈوبا دیکھ کر اس کی ننھی سی جان سہم جاتی جیسے دل کو کوئی مٹھی میں بھر کر نچوڑ رہا ہو۔

وہ گاؤں سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہاں کا ہر شخص جانتا تھا کہ اسے اور ماں کو اس کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ دراصل نکالا تو نہیں تھا۔ نانا ہی لے آئے تھے انھیں لیکن اس حالت میں عورت ہی ''چھوڑی ہوئی'' یا ''نکالی ہوئی'' سمجھی جاتی ہے لوگوں کی نظروں میں۔ اپنے آپ کو وہ کوڑا کچرا سمجھتی، گلیوں کا کوڑا جسے اکٹھا کر ڈھیر لگا دو لیکن ہوا چلتے ہی وہ ڈھیر بکھر کر پھر وہاں پھیل جاتا ہے۔

''میں آٹھویں سے بھی آگے پڑھوں گی باپو جی۔'' وہ اپنے نانا کو کہتی۔ وہ بہت سالوں سے کہتی آ رہی تھی یہ بات۔ کیونکہ مانک گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول آٹھویں تک ہی تھا اور وہ ابھی سے پکا ارادہ کر لینا چاہتی تھی کہ آٹھویں کے آگے بھی پڑھے گی، یعنی گاؤں سے باہر جا کر پڑھے گی۔

ویسے اسے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ صرف گاؤں کی چار دیواری اور لوگوں کی ترس کھاتی نظروں کے دائرے سے دُور ہٹ جانا چاہتی تھی اور اپنی پاگل ماں سے بھی۔ کئی بار وہ سوچتی ہر کتاب میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ ماں بچے کو بہت پیار کرتی ہے۔ سب ہی یہی کہتے ہیں ماں کا بچے کے ساتھ پیار لامحدود ہوتا ہے اور ہر بچہ اپنی ماں کو خدا سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ پھر اس کے دل میں ماں کے لیے پیار کیوں نہیں اُمنڈتا۔

یہی بات سوچ کر کئی بار اسے اپنا آپ بڑا ذلیل اور میلا میلا لگتا۔ میں کیوں نہیں کرتی اپنی ماں کو پیار۔ بڑی خراب ہوں میں۔ ہائے رب تو مجھے معاف کر دے، میں بہت خراب ہوں۔ ماں کو پیار نہیں کرتی، لیکن بابو جی کو تو میں کرتی ہوں نا پیار، یہ تو اچھی بات ہے نا۔ اس کی تو مجھے شاباشی دیں گے نا بابا جی۔ ٹھیک ہے ایک بات بری اور ایک اچھی۔ ٹھیک ہے نا رب جی۔

جب اس نے آٹھویں پاس کر لی گھسٹ گھسٹ کر تو اس کے نانا اسے چنڈی گڑھ میں نویں کلاس میں داخلہ کروا آئے اور ہوسٹل میں رہنے کا انتظام کروا آئے۔

راج نے پہلی بار کھلی ہوا میں سانس لی۔ پہلی بار اس کے پروں نے دُھوپ میں پوری طرح پھیل کر اُڑان کی دھڑکن محسوس کی۔

ایک عجیب طرح کی خوشی، چین اور آزادی کا تہوار مناتی رہی وہ۔ پڑھائی میں تو شروع

سے ہی اس کا دل نہیں تھا۔ اب تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا، کہ راج مٹی اسکول کا کام کیا یا نہیں۔

پڑھائی تو اسے نہ کرنی تھی اور نہ ہی اس کی پڑھنے کی خواہش تھی لیکن اسکول میں جو ڈانس کلاس ہوتی اس میں اس کا اتنا دل لگتا کہ نہ صرف اس کی کلاس کے پیریڈ بلکہ دوسری کلاسوں کے ڈانس پریڈوں میں بھی گھس جاتی اور ناچتی رہتی۔ ڈانس نہیں اصل میں بیلے کی کلاسیں ہوتی تھیں وہ، اس بیلے کی ٹیچر کے ساتھ ہی دہلی آ گئی۔ ویسے ٹیچر کو تو کسی بیلے گروپ میں نوکری مل گئی تھی اور راج اس کی منت، خوشامد کر کے اس کے ساتھ دہلی چلی آئی۔

نانا کو اس نے خط لکھا۔

"پیارے بابو جی، بڑے پیار اور احترام کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام قبول کریں۔ دن رات دعا کرتی ہوں کہ آپ کو اور ماں کو صحت حاصل ہو۔ آپ میری دعاؤں کی وجہ سے ضرور بخیریت ہوں گے۔ میں بھی آپ کی دعا سے یہاں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ میری بالکل فکر نہ کرنا جی۔ ماں سے بھی کہہ دینا میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ہمارے اسکول والے میری کلاس کی لڑکیوں کو لے کر دہلی جا رہے ہیں جی۔ سب ہی لڑکیاں جا رہی ہیں اور ساتھ ہی ہماری ٹیچریں بھی جا رہی ہیں۔ اس لیے جی آپ بالکل فکر نہ کرنا میں دہلی سے آپ کو خط لکھوں گی۔ بابو جی یہ اسکول کا ہی پروگرام ہے اس لیے میں جا رہی ہوں۔ آپ بالکل فکر مت کرنا۔"

دہلی آ کر اسے بیلے گروپ میں چھوٹی سی جگہ مل گئی۔ لیکن پیسے اتنے کم تھے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دہلی رہے یا واپس چنڈی گڈھ چلی جائے۔ یا پھر گاؤں میں واپس لوٹ جائے۔

اتنے چھوٹے سے گاؤں سے آئی سیدھی سادی لڑکی کے لیے دہلی اتنی چکا چوند کرنے والی جگہ تھی کہ اس کے پیرو ہیں چپک سے گئے۔ اس کی بیلے ٹیچر نے اس کی مدد کی جو اسے چنڈی گڈھ سے ساتھ لائی تھی۔ دہلی سے اس کا تعارف پرانا تھا۔ دہلی میں کچھ چھوٹے موٹے پروگرام بھی دے چکی تھی۔ اس نے راج کو ورکنگ گرلس ہوسٹل میں رہنے کی جگہ دے دی۔ پیسے کم تھے اس لیے راج نے آدھا کمرہ لیا۔ یعنی دو چارپائی والا۔ ایک چارپائی راج کی تھی، اور دوسری منسکھانی کی۔

منسکھانی بمبئی کے کسی کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے دہلی کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں آ کر نوکری کر لی۔ پہلے ٹی جی ٹی لگی یعنی چھوٹی ماسٹرنی پھر پی جی ٹی

ہوگئی پھر وائس پرنسپل ہوگئی پھر پرنسپل۔

تب تک زندگی نے کئی خزاں اور کئی بہاریں پار کرلیں۔ اس وقت وہ باون سال کی تھی۔ اس کی کوئی بھانجی فلم اداکارہ تھی جو کسی ساڑی کو دوبارہ نہیں پہنتی تھی۔ صرف ایک بار پہن کر الگ الماری میں پھینکتی جاتی، جب بھی خالہ پھوپی ممانی چچی ملنے آتیں یا ان کی بیٹیاں بہوئیں تو ساڑیوں کے اس رڈی ڈھیر میں سے دو چار پانچ ہر ایک کی نذر کردیتی وہ بھی خوش کہ الماری ساتھ ساتھ صاف ہوتی رہتی ہے، اور ممانیاں اور خالائیں اور ان کی تمام بہو بیٹیاں بھی خوش کہ نئی بے داغ اور نئے نئے اسٹائل کی ساڑیاں ملتی رہتی ہیں، اتنی بڑی فلم اسٹار سے جس کی ایک جھلک دیکھنے کو لوگ ترسا کرتے ہیں اور منسکھانی کے پاس تو اپنی بھانجی کی دی ہوئی ساڑیوں کا ڈھیر تھا۔

اس کے اپنے پاس بھی کافی پیسہ تھا، شیئر تھے، زیور تھے بہت کچھ تھا تنخواہ الگ، لیکن وہ الگ کمرہ لے کر نہیں رہتی تھی۔ کہتی کمرے میں اکیلے دل نہیں لگتا۔

ورکنگ گرلس ہوسٹل میں تب ایک کمرے کا کرایہ ساٹھ روپے تھا اور شیئر کرنے والے یعنی آدھے کمرے کا کرایہ تیس روپے مہینہ۔

اس نے راج کو بھی پہلے دوسرے دن ہی یہ سمجھا دیا تھا کہ دیکھ میرے پاس پیسے بہت ہیں، کام نہ بھی کروں تو پوری زندگی آرام سے عیش کرسکتی ہیں۔ چاہوں تو گولف لنک یا سندر نگر میں پوری کوٹھی کرایہ پر لے کر رہوں، صرف رہنا ہی ہوتا تو بمبئی میں سمندر کے کنارے ہماری اتنی بڑی کوٹھی ہے کہ آج کوئی ویسی کوٹھی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ شام کے وقت جب سمندر کی لہریں اُمنڈتی ہیں تب ان کی بوچھار کے چھینٹے ہمارے گھر کے برآمدے تک آجاتے ہیں۔ برآمدے میں پرانے زمانے کا جھولا لٹکتا رہتا ہے پیتل کے گھنگھروؤں والا جس پر چار پانچ آدمی آرام سے بیٹھ کر لہروں کا نظارہ دیکھ سکتے ہیں۔

راج کے لیے یہ باتیں پریوں کی دنیا جیسی تھیں۔ اتنے بڑے اور کھلے گھر، سمندر، پیسہ اور ساڑیوں کے ڈھیر۔

وہ چھوٹی سی ایلیس تھی جو کسی جادوئی ونڈرلینڈ میں آگئی تھی حیران ہوکر اپنے آس پاس کی جگمگاتی دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

منسکھانی نے اپنی طلسمی دنیا کی کہانی کا اثر پڑتے دیکھا تو چہک کر بولی ''لیکن میں زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتی ہوں۔ اپنے ڈھنگ سے اور اپنی شرطوں پر۔ میں کسی سالے کی دھونس نہیں سہہ سکتی۔ دُور رہنے سے ماں، باپ، بھائی، بھابیاں سب بیٹھے رہتے ہیں پلکیں

بچھائے راہ دیکھتے ہیں کہ ملنے آئے گی۔ پاس رہنے سے ہمیشہ کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر رشتہ نزدیک رہ کر کڑواہٹ پیدا کرتا ہے۔ سوائے دوستی کے رشتہ کے۔ باقی محبت وہبت سب بکواس ہے۔ دوستی کو ہی کئی لوگ محبت کہہ لیتے ہیں۔ اگر وہ ٹھوس اور ٹکاؤ ہو۔ ہم تو سیدھی چیز کا سیدھا ہی نام لیتے ہیں۔

اور وہ راج کے نزدیک سرک آئی۔ اپنی بانہہ سے راج کے کندھوں کو گھیر سا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے راج کو پکڑ کر ایسے سہلانے لگی، گویا میدہ میں دودھ ملا رہی ہو۔

''ہائے تمھارے ہاتھ اتنے سخت کیوں ہیں۔ یہ کچی عمر اور اتنے کھردرے ہاتھ۔''

راج شرما گئی جیسے ہاتھوں کا کھردراپن اسی کا قصور ہو۔ ''وہاں گاؤں میں میرے کام ہی ایسے ہوتے ہیں۔ برتن مانجنا، کپڑے دھونا، سانی ملانا، چارہ کا ٹکرا لانا، ناند صاف کرنا، کنڈے تھاپنا۔''

آدھی باتیں منسکھانی کے سمجھ میں آئیں آدھی نہیں۔ بمبئی میں پیدا ہوئی پلی بڑھی، کوٹھی کے برآمدے میں جھولے پر بیٹھے سمندر کی لہروں کی بوچھاروں کا لطف لینے والی عورت کے لیے، راج کی آدھی باتیں ناقابل حل معمہ تھیں۔

راج کے لیے بھی منسکھانی کی آدھی باتیں پہیلیاں تھیں۔

مخالف ماحول میں پلی ان دونوں کی پہیلیوں نے بھی شاید ایک بندھن سا پیدا کر دیا منسکھانی اسے ایک ایک انچ اپنی طرف کھینچتی چلی گئی۔

منسکھانی اس کے ہاتھوں پر بانہوں پر کریم اور تیل کی مالش کرتی۔

پھر دھیرے دھیرے اس کی شلوار کا پائنچہ اونچا کر کے اس کی پنڈلیوں پر بھی مالش کرنے لگی۔ راج کو یہی لگتا جیسے اس کی ماں اس کو دُلار کر رہی ہو۔ ایسے دُلار کے لیے ہی تو وہ تڑپتی رہی ساری عمر اور اس کی ماں تو پاگل پن میں اس کا وجود ہی بھول بیٹھی تھی۔

لیکن راج کو یہ سمجھ نہ آتی کہ جب منسکھانی اس طرح دھیرے دھیرے اس کے بدن کو سہلاتی تب اس کی سانسیں تیز کیوں ہو جاتی ہیں۔

راج نے اپنے نانا کو پیار سے بہت ہی پیار سے اور جتنے بھی عقیدت مندانہ لفظ اسے آتے تھے ان سب کا استعمال کر کے خط لکھا جس میں اس نے سب کچھ لکھ دیا کہ اس نے پڑھائی لکھائی چھوڑ دی ہے۔ پہلے اس نے غلط لکھا تھا ''بابوجی آپ کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگتی ہوں۔ آپ ہی میرے اور ماں کے سہارا ہیں۔ آپ تو ہمارے سر پر گھنے درخت کا سایہ ہیں، بس میں نے زندگی میں ایک ہی جھوٹ بولا ہے۔ آپ سے ویسے ایک بات سچ بھی

تھی کہ میری ٹیچر میرے ساتھ تھی ڈانس والی کلاس کی اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے اپنے بیلے گروپ میں مجھے نوکری دی ہے پڑھائی ویسے بھی میرے بس کی نہیں تھی اسی کام میں میرا دل لگتا ہے۔ یہاں لڑکیوں کے ہوسٹل میں جگہ مل گئی ہے۔ میرے کمرے میں میرے ساتھ جو عورت رہتی ہے وہ مجھے پچھلے جنم کی اپنی ماں لگتی ہے، اتنا پیار کرتی ہے مجھے، شادی نہیں ہوئی نا۔ شاید اسے اولاد کی بھوک ہوگی، میرا بڑا دھیان رکھتی ہے۔ آپ اور ماں بہت یاد آتے ہو۔ جب بھی چھٹیاں ہوں گی گاؤں آ جاؤں گی۔ آپ بالکل فکر مت کرنا جی۔''

نانا کو خط ملا تو وہ خود دہلی چلے آئے، پوچھتے پوچھتے ورکنگ گرلس ہوسٹل پہنچ گئے۔

گاڑی علی الصبح دہلی پہنچی تھی۔ ہوسٹل پہنچتے پہنچتے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ نئے شہر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پتہ ہی نہیں لگتا کونسی جگہ کہاں ہے۔

گیٹ بند تھا۔ چوکیدار گیٹ کے اندر کی طرف والے بائیں ہاتھ کے برآمدے میں بیٹھا گنگنا تا پھاٹک رہا تھا۔

بابو جی اسے بڑی ہی دیر تک آوازیں لگاتے رہے۔ ''اے بھائی صاحب ذرا بات تو سنیے'' مشکل سے ٹہلتا ہوا تھوڑا گیٹ کے پاس آیا اور ٹھوڑی کو اوپر اٹھا ہونٹوں کو اندر کی طرف دبا کرتا کہ گٹکے کا رس باہر نہ بہہ جائے، کہنے لگا ''کیا ہے؟''

''یہاں میری نواسی رہتی ہے راج۔ میں اس کا نانا ہوں اس سے ملنا ہے۔''

''ملنے کا ٹیم نہیں ہے یہ۔ ملنے کا ٹیم شام کو ہووے پانچ سے سات تک بس۔'' اور وہ پھر ٹہلتا ٹہلتا واپس چل دیا۔

گرمی تھی۔ پیاس بھی بہت لگی تھی نانا جی کو۔ سوچا تھا راج کے پاس پہنچ کر اس کے کمرے میں بیٹھ کر صراحی کا ٹھنڈا پانی پئیں گے۔ اب؟

چڑھ کر وہ چل پڑے سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جائیں۔ نیا شہر، نہ کوئی جان نہ پہچان۔ ابھی آدھا دن پڑا تھا۔ یہ بھی اچھا تماشہ ہے۔ اپنی سگی نواسی کو نہیں مل سکتا۔ منہ ٹیڑھا کر کے کہہ دیا ''ملنے کا ٹیم نہیں ہے یہ۔'' بھئی اس کا نانا ہوں میں۔ باپ بھی، ماں بھی اور نانا بھی۔ مل کیوں نہیں سکتا۔ جیل ہے یہ کوئی جہاں قیدیوں کو بس پانچ سے سات تک مل سکتے ہوں، حد ہوگئی، بھلے مانس تجھے دکھائی دے رہا ہے کہ میں ہانپ رہا ہوں۔ پھاٹک تو کھول تھوڑا سانس تو لینے دے پانی کا گلاس تو پلا ''نامراد شہریے، بے درد۔'' نانا جی نے چوکیدار کے بارے میں ہی نہیں سارے شہریوں خاص کر دہلی کے باشندوں کے بارے میں فیصلہ کر دیا۔

لیکن اب وہ آدھا دن کاٹا کیسے جائے۔

اچانک انھیں خیال آیا کہ بنگلہ صاحب گردوارے جایا جا سکتا ہے۔

کسی راہ چلتے سے پوچھا۔ ''کتنا دُور ہے؟'' اس نے کہا زیادہ دُور نہیں مشکل سے چار پانچ میل ہوگا۔

ایسے ہی نہیں پوچھ لیا بابو جی نے کسی سے۔ پہلے وہ کافی دیر تک کھڑے ہر راہگیر کا چہرہ دیکھتے رہے، کافی دیر بعد انھیں ایسا چہرہ نظر آیا جس سے کچھ پوچھا جا سکتا تھا۔

اور وہ بنگلہ صاحب جا پہنچے۔ راستہ میں انھیں گاؤں کے بنئے مہیش شاہ کی بات یاد آ گئی، اور وہ ہلکا سا ہنس پڑے مہیش شاہ امرتسر جا رہا تھا۔ بابو جی سے کہنے لگا ''دو دن امرتسر میں رہوں گا، نیا مال خریدنا ہے، اور اس بار کپڑوں اور کمبلوں کے بھاؤ بھی پوچھوں گا۔ سوچ رہا ہوں کہ ذرا بڑھاؤں اپنا کام'' بابو جی نے رواروی میں پوچھ لیا وہاں رہنے کے لیے کوئی جگہ ہے کوئی رشتہ دار وغیرہ۔

مہیش شاہ ہنس کر کہنے لگا ''وہاں میرے بابو جی کا گھر ہے۔''

بابو جی حیران ہوئے۔ مہیش شاہ کے تو دادا کو بھی انھوں نے دیکھا ہوا تھا، باپ کو بھی۔ باپ تو اس کا ابھی بھی زندہ تھا۔ کبھی آ کر بیٹھتا گھنٹے دو گھنٹے گدی پر۔ ان کا آبائی مکان اسی گاؤں میں تھا۔ امرتسر میں کب اس کے باپ نے مکان بنوالیا۔ ایسے بھی کبھی ہوتا ہے۔ اتنی بڑی بات آج تک پتہ کیوں نہیں لگی۔ گاؤں تو چھوٹا سا خاندان ہوتا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے کی ہر بات پتہ ہوتی ہے۔ ہے کہ نہیں۔

''کب بنالیا تیرے باپ نے مکان امرتسر میں چوری چوری۔ ہیں؟''

مہیش شاہ کھل کر ہنسا ''جی باپ نے نہیں۔ بابو جی نے۔ بابو جی یعنی میرے پر دادا کے بھی پر دادا۔ چار سو سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ پھر اس پر سارے خاندان کا حق بنایا نہیں۔''

''بنا تو ضرور بھئی لیکن پہلے تو کبھی نہیں بتایا تمھارے دادا نے نہ تمھارے باپ نے۔''

مہیش شاہ ہنستا جا رہا تھا۔ ''وہ تو ہم سب کے بابو جی کا گھر ہے بادشاہو۔ ہری مندر صاحب۔ خوبصورت بستر، چار پائیاں، نہانے کے لیے ٹھنڈا پانی۔ امرت جیسی روٹی آدمی کو اور کیا چاہیے۔ آپ خود ہی بتائیں۔

شام کو پھر ہوسٹل آ پہنچے۔ اب گیٹ کھلا تھا۔

دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں جا کر انھوں نے عاجزی سے کہا (ویسے ہر دیہاتی شہر جا کر اسی لہجہ میں بولتا ہے) ''راجی سے ملنا ہے۔''

''کمرہ نمبر؟'' وارڈن نے پوچھا۔

''وہ تو جی مجھے پتہ نہیں۔''

وارڈن نے رجسٹر دیکھا۔ کمرہ نمبر سترہ، گھنٹی بجائی۔

چوکیدار ٹہلتا ہوا اندر آیا۔ ''سترہ نمبر سے راج کو بلا لا کوئی ملنے آئے ہیں۔''

''میں اس کا نانا ہوں۔ کہنا گاؤں سے بابو جی آئے ہیں۔''

چوکیدار گیا۔ کافی دیر بعد ٹہلتا ہوا واپس آیا۔ ''وہ تو کمرے میں نہیں ہیں۔'' بابو جی کو دفتر کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھا دیا گیا۔ وہ لڑکیوں سے یعنی ہوسٹل میں رہنے والی عورتوں سے ملنے جلنے والوں کا کمرہ تھا۔

پانچ سات عورتیں اپنے ملنے والوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کئی تو بالکل سر سے سر جوڑ کر کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ بابو جی کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ جب تک راجی آ نہ جائے وہیں بیٹھنا پڑے گا۔

چوکیدار راج کو بلانے جب سترہ نمبر کمرے میں گیا منسکھانی کمرے میں ہی تھی اور پاپڑ تل رہی تھی۔ ویسے تو ہوسٹل میں ایک مشترکہ کینٹین بھی تھی جس میں دو باورچی تھے ایک برتن مانجنے والی مائی، جو ڈائننگ روم کی صفائی بھی کرتی تھی۔ لیکن زیادہ تر عورتوں نے اپنے کمرے میں اسٹوو یا بجلی کے چولھے رکھے ہوئے تھے۔ بجلی کے چولھے رکھنے کی اجازت تو نہیں تھی۔ لیکن سب نے چھپ کر رکھے ہوئے تھے کیونکہ اسٹوو کے تیل کی بدبو سارے کمرے میں بھر جاتی تھی۔ ہر کمرے کے باہر چھوٹی سی بالکنی تھی اور پچھلی طرف ایک مشترکہ گیلری لیکن بالکنی میں رکھ کر اسٹوو جلانے سے اگر تھوڑی بھی ہوا چلتی تو اسٹوو کی لَو برابر نہ رہ پاتی اور اسٹوو پر رکھی چیز کو پوری آنچ نہ لگتی۔ قسمت سے جنھیں کونے والے کمرے ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی بالکنی کے کچھ حصے کو چقوں سے ڈھک لیا تھا۔ جہاں مزے سے روٹی پکائی جا سکتی تھی۔

ویسے اکیلی عورتوں کو صرف اپنے لیے روٹی پکانے میں بڑی سستی آتی تھی اور ایک عجیب سی اُداسی بھی۔ کینٹین سستی تھی۔ چالیس روپے مہینے روٹی کے جس میں صبح کی چائے اور دو سلائس بھی شامل تھے، کھانے کے وقت پانی جیسی ایک دال اور چارے جیسی موٹی موٹی کٹی ہوئی نان اور بے دلی سے پکائی ہوئی سبزی اور روٹی چاول۔ لیکن ڈائننگ ہال کی لکڑی کی لمبی بیڈول میزوں پر گپیں لگاتے ہوئے روٹی کھانے سے اس کی بدمزگی کچھ کم ہو جاتی۔ عورتیں اپنے کمروں سے اچار کی بوتلیں ساتھ لے آتیں اور روٹی کھا لیتیں۔

لیکن منسکھانی کو کینٹین کی روٹی بالکل پسند نہیں تھی اپنی کسی روم میٹ کے ساتھ ڈائننگ

بال بانٹنا بھی اسے منظور نہیں تھا۔

لیکن وہ ہر شام پاپڑ اور چھوٹی چھوٹی پھلکیاں تلتی، چائے بناتی اور رات کے لیے کھچڑی اور دودھ لے کر بڑے شوق سے پتھر کے کٹورے میں دہی جماتی۔ آدھا اطمینان اسے روٹی پکا کر ہوتا، اور آدھا راج کو کھاتے دیکھ کر۔

راج اس سے کئی بار پوچھتی ''مجھ سے پہلے کون تھا اس کمرے میں؟'' منسکھانی کہتی ''نام مت لو اس کا۔ نمک حرام عورت تھی۔ کتنی خدمت کی میں نے وہ بڑی بے وفا نکلی۔''

''کس طرح؟'' راج پوچھتی۔

''بس بات نہ کرو اس کی۔ کبھی پھر بتاؤں گی تمہیں۔ اس وقت موڈ مت خراب کرو۔

منسکھانی پاپڑ تل رہی تھی اور راج کا انتظار کر رہی تھی۔

چوکیدار نے آ کر بتایا کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ منسکھانی کی کڑچھی تیل میں ہی ٹھٹک گئی اور پاپڑ جل کر راکھ ہو گیا ''کون کمبخت آ مرا، اس موئی کو بھی ملنے۔'' وہ بوکھلائی۔ گھبرا کر اس نے جلے ہوئے پاپڑ کو باہر نکالا۔ دو چار پاپڑ اور مٹھی بھر پھلکیاں تلیں، چائے بنائی، ٹرے میں کڑھائی کا ٹاتھ بچھایا۔ پاپڑ اور پھلکیوں کی پلیٹ رکھی۔ چائے کی کیتلی، دودھ دانی، شکر دانی، دو کپ پلیٹ اور تین تین چمچے رکھ کر وہ گیسٹ روم کی طرف چل پڑی۔

وہ کچھ ڈری ہوئی تھی۔ کچھ غصہ میں بھی۔ ''پتہ نہیں کون آ گیا اس سے ملنے۔''

گیسٹ روم میں آ کر اس نے ایک نظر سب پر دوڑائی۔ دل ہی دل میں ان تمام عورتوں کو دو چار مردانہ گالیاں دیں، جو اپنے عاشق کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ تب ہی ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھے بابو جی کو دیکھا۔ بڑی تسلی ہوئی اسے ''اگر وہ یہی ہے میری رجو کو ملنے والا تو خطرے کی کوئی بات نہیں۔'' بابو جی کی مٹی سے کئی جوتی سیدھی سی سفید پگڑی۔ ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ اور کندھے پر رکھی چادر کا انداز لیتی ہوئی وہ دو قدم اس کی طرف بڑھی ''آپ ہی راج سے ملنے آئے ہیں؟''

''ہاں جی۔ آ گئی ہے وہ۔؟'' منسکھانی صبر سے مسکرائی ٹرے بابو جی کے سامنے میز پر رکھ کر ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی ''بس آتی ہی ہو گی۔'' ''میں اس کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ ہم ایک ہی کمرہ شیئر کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آدھا کمرہ اس کا ہے اور آدھا میرا۔ آپ یہ پاپڑ کھاؤ۔ میں باہر چوکیدار کو کہہ آؤں کہ راج آئے تو اسے سیدھا یہیں بھیج دے۔''

بابو جی کو یہ عورت بڑی بھلی لگی۔ ویسے مردوں جیسی عورت تھی، دھڑلے دار، مردوں جیسے کٹے بال، چال میں بھی لاپرواہی، رعب دار لیکن راج نے لکھا تھا کہ ماں جیسا پیار کرتی ہے، اس

کا بڑا دھیان رکھتی ہے۔ اچھی تو ہوگی ہی بے چاری، جب اتنے بڑے شہر میں اکیلا رہنا پڑے تو رعب داب تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی آسان ہے اس طرح اکیلی عورتوں کا اتنے بڑے دیو جیسے شہر میں رہنا اور پھر کمائی بھی کرنی اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر ساری دنیا کے ساتھ اکیلے لڑنا۔ ہے کہ نہیں۔

بابو جی ابھی سوچ میں ہی ڈوبے تھے کہ منسکھانی واپس آ گئی ''آپ نے پاپڑ تو کھایا ہی نہیں۔ میری ماں انھیں گھر میں بناتی ہے خود اپنے ہاتھ سے۔ میں جب بھی بمبئی جاتی ہوں، ڈبہ بھر دیتی ہیں۔ ٹھنڈے پاپڑ کا کوئی مزا نہیں۔ پاپڑ تو بس گرم گرم ہی مزیدار لگتا ہے۔ جب دانت کے نیچے کر کرائے۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اور وہ بابو جی کے لیے چائے بنانے لگی۔

ایسے چھوٹے چھوٹے پیالوں سے بابو جی نے کبھی چائے نہیں پی تھی۔ وہ تو لوٹے میں پیتے تھے۔ آدھا دودھ آدھی چائے جی بھر شکر۔ کوئی برابری ہے شکر کی۔ خالص شہد۔ گھر کی بنی شکر۔ گھر کا گڑ۔ یہ شکر بنانے والے تو اس کی ساری مہک ہی نکال لیتے ہیں۔ بابو جی سوچ رہے تھے لیکن وہ بولے کچھ نہیں۔ چپ چاپ چائے کا پیالہ پکڑ سڑک سڑک کر پینے لگے۔

منسکھانی اطمینان سے دل ہی دل میں مسکرا گئی۔ بابو جی کی سڑکنے کی آواز سے اسے ایک عجیب سکون مل رہا تھا۔ ایک انوکھا یقین راج کے بارے میں۔

تب ہی راج آ گئی۔ آتے ہی دوڑ کر ملی۔ وہ بابو جی سے گلے سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

بابو جی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں، لیکن اتنے پت جھڑ دیکھے تھے انھوں نے اور اتنا دکھ پیا تھا کہ وہ روئے نہیں۔

جن لوگوں نے لمبے دکھ دیکھے ہوتے ہیں، وہ روتے نہیں۔ روتے وہی ہیں جنھوں نے زندگی کی روز دھوپ ابھی شروع ہی کی ہوتی ہے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے دکھ دیکھے ہوتے ہیں، جن کے دل کی مٹی ابھی نرم ہوتی ہے بعد میں یہ مٹی سخت ہو جاتی ہے۔ تب آدمی بادلوں کو برسنے نہیں دیتا انھیں پی جاتا ہے۔

وہ قریب آدھے گھنٹے بیٹھے رہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں لاکھی گائے ٹھیک ہے، بچھڑا دیا اس نے، کیسا ہے؟ ماتھے پر چاند ہے کہ نہیں؟ ماں کیا کرتی ہے؟ ناراض تو نہیں ہے وہ مجھ سے؟ کھانا پکا دیتی ہے وقت سے آپ کے لیے؟ آپ اپنی صحت کا دھیان رکھتے ہو نا؟ میں تو اب وہاں ہوں نہیں، رات کو دودھ کا گلاس کون دیتا ہے آپ کو بالائی ڈال کر؟ آپ کے بالوں میں تیل

کون ملتا ہوگا؟ بابو جی میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ آپ نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا، اور میں آپ کی خدمت بھی نہیں کر سکتی، باتیں کرتے کرتے راج کی آنکھیں بھر آئیں۔ بابو جی اسے تسلی دینے لگے منسکھانی چپ چاپ سب کچھ دیکھتی رہی، سنتی رہی اور پھر چوکیدار نے آ کر آواز دی ''میم ختم، سات بج گیا۔ خالی کرو یہ کمرہ جھپا جھپ۔''

راج نے بابو جی کو بڑی مظلوم نظر سے دیکھا۔ کچھ زخمی تھی وہ نظر۔ بابو جی نے کہا کوئی نہیں بیٹا۔ مجھے تو ویسے ہی رات کی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ تمھاری ماں اکیلی ہے وہاں۔ میں پھر آؤں گا جلدی آؤں گا۔ اس بار تو میں تمھاری چٹھی ملتے ہی آ گیا نہ۔ دل ہی نہیں مانا اگلی بار تیرے لیے گنے لاؤں گا پنی لاؤنگا، اور میوے والا گڑ تمھیں بڑا اچھا لگتا ہے نہ مجھے پتہ ہے۔ اور وہ کھڑے ہو کر راج کا سر سہلانے لگے کانپتے ہاتھوں سے۔

''آپ ناراض تو نہیں بابو جی؟ میرے دہلی آنے سے'' راج نے بھولی سی آواز میں پوچھا۔

منسکھانی کہنے لگی ''آپ بالکل فکر نہ کرنا اس کی میں جو ہوں یہاں۔ میں اس کا پورا خیال رکھتی ہوں۔ دہلی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دہلی میں وہی لڑکیاں بگڑتی ہیں، جن پر کوئی روک ٹوک نہ ہو، میں اس کا پکا تالہ ہوں۔ باندھ کر رکھتی ہوں، اسے مجال ہے کہ ہل بھی جائے۔ کیوں رجو؟'' اور وہ ہنسنے لگی۔

بابو جی کے اس طرح تسلی سے چلے جانے کے بعد وہ منسکھانی سے بے ساختہ لپٹ گئی۔ ''او دیدی آپ کتنی اچھی ہیں۔''

اس کے دل سے گویا منوں بوجھ اُتر گیا۔ نہ بابو جی ناراض ہوئے۔ نہ چوٹی پکڑ کر واپس گاؤں لے گئے۔ اصل میں وہ بہت پیار کرتے تھے اس سے۔ حالانکہ ان کی بیٹی راج کی ماں زندہ تھی، تب بھی بابو جی کو راج ہمیشہ بے چاری یتیم سی لگتی۔ وہ سوچتے میں ہی اس کی ماں ہوں اور میں ہی باپ، بے چاری بچی اس میں کس کے سر پر لاڈ کرنے ہیں جتنی دیر اس کے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے۔ بے چاری کر لے اپنی من مانیاں پوری۔

ایسے بابو جی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ بیلے کیا ہوتا ہوگا۔ وہ سمجھتے تھے رام لیلا جیسا کوئی ڈرامہ ہوتا ہوگا۔ ایک بار پوچھا بھی انھوں نے کسی سے۔ جس سے پوچھا اس نے یہی بتایا اور بابو جی نے سوچا چلو رام لیلا بھی تو بھگوان کا نام ہے اس طرح نہ لیا تو اس طرح لے لیا ٹھیک ہے نا۔ راج منسکھانی سے بے ساختہ لپٹ گئی تو اس نے بڑی دیر تک راج کو اپنی بانہوں سے جکڑے رکھا۔ راج کو کچھ اٹ پٹا بھی لگا لیکن پھر سوچا لاڈ بھی تو اتنا کرتی ہے مجھے۔ بابو جی کے لیے چائے بنا

لائی۔ پاپڑ تل کر دے گئی اور کتنی تسلی دی انھیں۔ وہ ہلکے دل سے گاؤں واپس گئے، اچھی عورت ہے۔ گلے میں تو لگا رہی ہے اور کیا۔ مائیں نہیں ملتیں اپنی بیٹیوں سے اس طرح۔ چاہے اس نے بھی ماں نے کبھی اس طرح بانہوں میں نہیں لیا پھر بھی اسے پتہ تو تھا ہی۔ بہنیں بھی گلے ملتی ہیں۔ سہیلیاں بھی، ہے کہ نہیں؟۔

تب ہی منسکھانی نے زور سے اس کا گال چوم لیا اور وہ کانپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ منسکھانی نے محسوس کیا کہ ذرا جلدی ہوگئی۔ جلدی جلدی باتیں کرنے لگی۔ دو اور ساڑیاں الماری سے نکال راج کو دے دیں۔ تمھیں یہ رنگ پسند ہیں نا؟۔ بڑے کھلیں گے تم پر۔ کل میرے ساتھ بازار چلنا، ان کے لیے میچنگ پیٹی کوٹ خریدوں گی، تمھارے لیے اور بلاؤز کے کپڑے۔ یہ جو بوڑھا درزی ہوسٹل میں بیٹھتا ہے اسے تو کپڑے کی فیٹنگ کی عقل بھی نہیں ہے۔ شنکر مارکیٹ میں ہے میرا درزی ایسی فٹنگ دیتا ہے کہ کپڑا پہن کر بدن بت جیسا تراشا ہوا لگے۔''

وہ راج کو پچکار رہی تھی۔

پہلی بار ایسی خوبصورت ساڑیاں، نرم ریشم کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے راج بہل گئی۔

''ہائے تیرا بدن کتنا روکھا ہوگیا ہے۔ لا مالش کردوں' منسکھانی تیل کی شیشی لے کر اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی۔

راج کو اس سے عجیب سا ڈر لگنے لگا۔

کئی بار رات کو بتی بجھانے کے بعد راج کے بستر پر بیٹھ کر اس کے گال اور اس کی گردن سہلاتی رہتی اور راج دم سادھے پڑی رہتی جیسے سو رہی ہو۔

ایسے ہر واقعہ کے بعد جب منسکھانی کو اس کی آنکھوں میں تیرتا ڈر نظر آتا وہ اسے کبھی شلوار قمیص سلا دیتی کبھی نئی ساڑی دے دیتی، یعنی ساڑیوں کے اس ڈھیر سے جو اس کی ایکٹریس بھانجی نے تحفہ کے طور پر اسے دے دی ہوتیں۔ دیتی ہی رہتی تھی ہر بار جب بھی وہ دہلی آتی یا منسکھانی چھٹیوں میں بمبئی جاتی۔

لیکن اس نے راج سے کہہ دیا تھا۔''اس بار چھٹیوں میں میں بمبئی نہیں جاؤں گی۔ بس تمھارے ساتھ رہوں گی۔ کہو گی تو تمھیں ڈلہوزی لے جاؤں گی یا شملہ، تو نے دیکھا ہی کیا ہے دنیا کا۔ تمھارا سارا بچپن راکھ ہوگیا۔ تمھارا وہ حرامی باپ میرا بس چلے تو پکڑ کر چوک میں جوتے ماروں اسے۔ یہ مرد سارے ہی سؤر ہوتے ہیں۔ میرا دل تو کرتا ہے سب کو کاٹ کر بھون کر کھا جاؤں۔''

''لیکن دیدی آپ تو کھچڑی کھاتی ہو۔ سؤر کا گوشت کیسے کھاؤ گی؟'' راج ہنستی اور

منسکھانی سہلانے لگی۔

راج جس بیلے گروپ میں تھی اس کا شو ہوا۔ راج کا چھوٹا سا رول تھا، پورے گروپ ڈانس کا ایک حصہ تھا وہ۔ لیکن وہ اتنی خوش تھی جیسے جھولی بھر تارے توڑ لائی ہو منسکھانی بھی شو دیکھنے آئی۔

شو کے بعد راج جب گرین روم میں جا کر کپڑے بدلنے لگی تو منسکھانی نے پیچھے سے آ کر اسے دبا لیا ''کتنی سندر لگ رہی ہو۔ ابھی مت بدلو کپڑے، چلو ٹیکسی لے کر اسی طرح ہوسٹل چلتے ہیں۔''

راج نے چونکہ منسکھانی کی دی ساڑی ہی پہنی ہوئی تھی۔ مچھلی بیچنے والی عورت کی طرح ننگی پنڈلیاں، کیسے ٹالتی وہ اس کی بات۔

دونوں ہوسٹل آ گئیں۔

''میں خود اتاروں گی تمھارے کپڑے۔ کپڑے پہننے میں جتنی نفاست ہوتی ہے انھیں اتارنے میں بھی اتنی ہی پوئٹری ہونی چاہیے۔''

اور منسکھانی دھیرے دھیرے اس کے کپڑے اُتارنے لگی۔ پھر ویسے ہی لٹا کر اس کے سارے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''تمھارا بدن ستار ہے، دلربا ہے، تان پورہ ہے، کسی ہوئی مردنگ ہے''

''ہائے میری جان میری جانو میری رجو۔''

اس رات راج بہت دیر تک روتی رہی۔ منسکھانی اسے مناتی رہی۔ ''معاف کر دو، مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنا برا مان جاؤ گی۔ پلیز مت رو، میں نہیں برداشت کر سکتی تمھارے آنسو۔ کیا کروں میں اپنے دل کا۔ آئی لو یو سو مچ۔''

اور دوسرے دن منسکھانی اسکول نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے راج کو کہیں جانے دیا بڑی خوشامد سے وہ اسے اپنے ساتھ دریبہ لے گئی اور ایک منر مالا خرید دی۔

بینک جا کر پہلے پیسے نکلوائے۔ پھر دریبہ پہنچ کر اپنے جان پہچان کے سنار سے کہا ''جیسی مالا آپ سے میری بھانجی لے گئی تھی ایک دانہ سونے کا ایک مونگے کا اور ایک اصلی موتی کا ویسے ہی چاہیے مجھے۔''

سنار نے کہا ابھی تو تیار نہیں۔

منسکھانی اڑ گئی۔ ''تیار کیسے نہیں؟ میری بھانجی کا خط آیا ہے کہ اس نے ویسی ایک اور مالا کا آرڈر آپ کو دیا تھا اور آپ نے اسے لکھا ہے کہ تیار ہے فی الحال وہی میرے حوالے کر دو اور

اس کے لیے اور بنوا دو۔"

چودہ ہزار کی مالا خرید کر اس نے راج کے گلے میں ڈال دی۔

راج کو کیلاش بیلے گروپ میں ہی ملا تھا، گروپ کے جو گرو جی تھے انھیں کا دوست تھا، وہ پہلی بار جب وہ راج کو ہوسٹل ملنے گیا۔ راج نے منسکھانی سے کہا "میری خالہ کا بیٹا ہے۔ چنڈی گڈھ میں رہتا ہے، ملنے آیا ہے، بابو جی نے بھیجا ہے۔"

"لیکن تم تو کہتی تھیں تمھاری ماں ایک ہی بیٹی ہے تمھارے نانا کی۔" منسکھانی نے کچھ شبہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ویسے شک کو چھپانے کی پوری کوشش کی اس نے لیکن راج سمجھ گئی کہ یہ خرانٹ عورت بحث کرکے اس سے اگلوا رہی ہے کہ آخر یہ کیلاش ہے کون؟

"نہیں میری سگی خالہ نہیں۔ ماں کی پھوپھی کی بیٹی بہن ہی لگی نا اس کا بیٹا ہے۔"

منسکھانی کو پتہ تھا راج جھوٹ بول رہی ہے لیکن وہ چپ رہی، رات کو کھانا کھاتے وقت بھی وہ منہ پھلائے رہی۔

پہلے تو راج نے سوچا اسے منا لے۔ ذرا گلے میں بانہیں ڈالنے کی ہی تو دیر ہے فوراً مان جائے گی وہ۔

لیکن آج اس کا دل نہیں مانا۔

وہ چپ رہی۔

جب پانچویں دن شام کو کیلاش پھر اس سے ملنے آیا دونوں گیسٹ روم میں بیٹھنے کے بجائے باہر چلے گئے، تو منسکھانی تلملائی۔

نہ اس نے کھچڑی پکائی نہ کچھ کھایا نہ راج کے لیے کچھ پکا کر رکھا۔

راج واپس آئی تو کمرے میں اندھیرا تھا، وہ سمجھ گئی کہ پروٹسٹ یعنی مخالفت ہو رہی ہے، منہ پھلائے بیٹھی ہے۔ جائے جہنم میں۔ اس نے سوچا اور کپڑے اٹھا کر غسل خانہ میں نہانے چلی گئی آج وہ بالٹی اور فنائل بھی ساتھ لے کر نہیں گئی۔

اصل میں ہوسٹل کی ہر منزل پر کمروں کی قطار کے بیچ بیچ چار چار غسل خانے اور لیٹرینیں بنی ہوئی تھیں جو سب کے ساجھے میں تھیں۔ منسکھانی ہمیشہ فینائل، جھاڑو، بالٹی، اور مگ ساتھ لے کر جاتی۔ کئی اور عورتیں بھی ایسے ہی کرتیں پہلے غسل خانے کو رگڑ رگڑ کر دھوتیں پھر فینائل پانی میں گھول کر چھڑکتیں، اور تب نہاتیں۔ منسکھانی نے راج کو بھی شروع سے یہی عادت ڈالی ہوئی تھی۔

راج نہا کر واپس آئی تو آ کر چپ چاپ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور کیلاش کے ساتھ

گزارے پچھلے دو تین گھنٹوں کو یاد کرنے لگی۔

اس کے پیٹ میں جیسے بہت ساری چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

پھر وہ سو گئی۔

نہ جانے کب کتنی رات گئے نیند میں ہی جیسے اسے کسی کے سسک سسک کر رونے کی آواز آئی۔ پہلے تو اس نے سوچا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے اور خواب میں دور کوئی رو رہا ہے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے جاگی اور آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ تو منسکھانی رو رہی ہے۔

پہلے تو راج نے سوچا'' جائے بھاڑ میں کُتیا۔ بہت ہی شوق ہے چھیڑ چھاڑ کا تو شادی کیوں نہیں کر ڈالی سیدھی طرح۔ اب بھی کر ڈالے کوئی تو مل ہی جائے گا۔ بوڑھا کھوسٹ لیکن یہ چڑیل تو اپنے کو بوڑھی سمجھتی ہی نہیں۔ کہتی ہے پچاس سے تو اصلی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ہو۔ مرے۔ میں کیا کروں۔

لیکن پھر کسی کا اس طرح ذلیل ہو کر رونا اس سے برداشت نہیں ہوا۔ راج اصل میں بڑی نرم دل تھی۔ کئی بار تو وہ منسکھانی کی اوٹ پٹانگ حرکتیں اس لیے برداشت کر لیتی تھی کہ کہیں بے چاری کا دل نہ دُکھ جائے۔ پھر اس کے لیے کیا کچھ کرتی رہتی تھی۔ وہ کم و بیش سب ہی کپڑے اسے منسکھانی نے ہی دیے تھے۔ کبھی اپنی ساریاں نکال کر دے دیتی، یا پھر نئے سوٹ سلوا دیتی سارا دن جیسے اسی میں مشغول رہتی اور پھر اتنا مہنگا گلوبند (مالا) اتنا خوبصورت، بیلے گروپ کی سب ہی لڑکیاں ہاتھ لگا لگا کر دیکھتیں کہتیں اتنی خوبصورت مالا تو ہم نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ وہ اٹھی اور منسکھانی کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ منسکھانی کی سسکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ راج نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے دوپٹے کے کونے سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

منسکھانی نے کھینچ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ روتی جا رہی تھی اور اسے چومتی جا رہی تھی'' ہائے کبھی مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میں بہت اکیلی ہوں۔ زندگی نے مجھے بہت ستایا ہے مجھے اکیلے مت چھوڑ جانا۔''

دوسرے دن ساری لڑکیاں راج کو چھیڑ رہی تھیں۔'' یہ تیرے ہونٹ کیوں سوجے ہوئے ہیں''

''رات کو بھونرا کاٹ گیا تھا۔''

''ہائے میں مر جاؤں، بھونرا اور وہ بھی رات کو۔''

''رات کو نہیں، شام کے وقت، بتی جو جل رہی تھی نا کمرے کی۔ آ گیا کہیں سے بدتمیز کالا بھونرا۔''

''اور آ کر سیدھے تمھارے ہونٹوں پر بیٹھ گیا'' بیلے گروپ کی لڑکیاں ہنستی جارہی تھیں۔

''بڑا اسیانا بھونرا تھا۔''

''شاعر تو نہیں تھا؟ کوئی شاعری تو نہیں سنا گیا اور ساتھ ہی کاٹ بھی گیا۔''

''کوئی گانا وانا۔''

اور راج جیسے جیسے جھینپتی لڑکیاں اور چڑھاتیں۔ انھیں کیا پتہ کہ.....

جب کبھی بھی ہوسٹل کی کسی لڑکی کو رات نو بجے کے بعد آنا ہوتا تو پہلے اسے وارڈن سے اجازت لینا پڑتی۔ وارڈن سو احسان جتاتی ہوئی ایک چٹ پر دستخط کر دیتی ''دس بجے تک کی اجازت'' اگر زیادہ ہی مہربان ہو جائے تو ''گیارہ بجے تک کی اجازت'' وہ چٹ پاسپورٹ ہوتی بارڈر پر جو روز رات ۹ بجے بند ہو جاتا اور چوکیدار باقاعدہ اندر سے تالہ لگا کر اپنے کو اس سلطنت کا سلطان اور بادشاہ سمجھتا اور بڑی منک سے دور دفتر کے برآمدے سے ٹہلتا ہوا آتا۔ بہت سنجیدہ اور احسانی انداز بنا کر جنگلے میں سے چٹ پکڑتا ٹارچ جلا کر چٹ کو لمحہ بھر گھورتا اور پھر گیٹ کھول دیتا۔

لیکن منسکھانی رات کو دیر سے لوٹنے کے لیے کبھی بھی وارڈن کے منہ نہ لگتی وہ ہر چوکیدار کو دیوالی دسہرا اور دیگر تہواروں پر پیسے دیتی، اس کے معنی یہ نہیں کہ اسے شام کو گھومنے جانے کا شوق تھا۔ وہ باہر بہت کم جاتی بس کبھی کبھی راج کے ساتھ کناٹ پلیس تک شاپنگ کے لیے چلی جاتی کبھی کبھی اچھے مسالوں اور خالص سرسوں کے تیل کی تلاش میں بنگالی مارکیٹ چلی جاتی یا پھر آئی این اے مارکیٹ جہاں سرسوں کے تیل کا کولہو اور مسالے پیسنے کی چکیاں تھیں۔

جب بھی وہ راج کے ساتھ سینما دیکھنے جاتی۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی کہ راج کو سینما دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اندھیرے میں کرسی پر بیٹھی وہ ذرا راج کی طرف جھکی رہتی، اور اندھیرے ہال میں ہمیشہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی۔

راج جب پہلی بار اس طرح سینما دیکھنے گئی، انٹرول میں گھڑی دیکھ کر بہت گھبرائی۔

''دیدی نو سے پہلے کیسے پہنچیں گے واپس؟'' منسکھانی ہنسی ''بچی ہے۔'' اس نے سوچا ''میرے ساتھ ہونا۔ تمھیں کیسی فکر۔''

''لیکن نو بجے کے بعد تو چوکیدار گیٹ ہی نہیں کھولتا۔ اور ہم وارڈن میم صاحب سے چٹ لے کر بھی نہیں آئیں۔ اندر کیسے جائیں گے۔ اگر اس نے گیٹ نہ کھولا تو باہر پل پر کیا

ساری رات بیٹھے رہیں گے۔''

منسکھانی سنتی جارہی تھی اور ہنستی جارہی تھی۔ چہک چہک کراس کے بھولے پن پر بے حد لاڈ آرہا تھا اسے۔ ہائے اگر ابھی وہ اسے پکڑ کر چوم سکتی۔ اپنے ہونٹوں سے اس کی یہ بھولی بھالی بک بک بند کرسکتی۔

کیلاش کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔

دو چار بار راج پیار سے زور ڈال کر منسکھانی کو بھی ساتھ لے گئی، تینوں نے کناٹ پلیس میں پکچر دیکھی۔ ڈنر کھایا۔

منسکھانی کو اس میں رتی بھر بھی خوشی نہ ہوتی۔ الٹے تناؤ بڑھتا ہی تھا۔

اب بھلا کیلاش کے ساتھ سینما جانے میں کیا مزہ تھا۔ سارا وقت وہ اندھیرے میں آنکھوں کے کونوں سے ان کی چوکیداری ہی کرتی رہتی کہیں ہاتھ پکڑے تو نہیں بیٹھے کہیں کیلاش کا بازو راج کی بانہہ کو تو نہیں چھو رہا ہے۔ کہیں دونوں ایک دوسرے کی طرف جھک کر تو نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دھیرے دھیرے راج نے منسکھانی سے ساتھ چلنے کے لیے کہنا بند کر دیا۔ آہستہ آہستہ دونوں میں تناؤ بڑھتا جارہا تھا۔

راج رات کو اکثر دیر سے ہوسٹل لوٹتی۔ وارڈن کو مسکا وسکا لگا وہ اس سے لیٹ آنے کی چٹ لے جاتی۔ بہانہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا کہ بیلے کا ریہرسل ہے۔ بیلے شو کی تیاری ہو رہی ہے۔ شو ہے وغیرہ۔

آخر ہار کر ایک دن منسکھانی نے وارڈن سے بات کی ''دیکھو مسز ملہوترا ویسے تو وہ میری کچھ نہیں لگتی لیکن روم پارٹنر تو ہے نا۔ مجھے تو کھانا کھا کر جلدی سونے کی عادت ہے اور وہ آجکل آئے دن آدھی رات گئے لوٹتی ہے۔ اجازت تو آپ سے ہی لے کر جاتی ہوگی نا۔''

''ہاں مجھ سے ہی لے کر جاتی ہے۔ لیکن روم پارٹنر کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ اس کے آنے جانے پر پابندی لگا سکتی ہیں۔ اور گیارہ بجے تو لوگ عام سوتے ہیں، گیارہ بجے تو آدھی رات نہیں ہوتی۔''

''سوتے ہوں گے۔ آپ لوگ بھی سوتے ہوں گے گیارہ بجے کیونکہ آپ کی ڈیوٹی تو شاہی ڈیوٹی ہے۔ اپنے فلیٹ سے نکلے اور آکر بیٹھ گئے دفتر میں۔ نہ بیٹھے تو بھی کوئی بات نہیں۔ وہ آپ کی اسسٹنٹ کم اکاؤنٹینٹ کم رپورٹر جو بیٹھی ہوتی ہے مس پرکاش۔'' منسکھانی کو غصہ آ گیا۔

''دیکھیے مس منسکھانی اگر کوئی خاص شکایت ہے آپ کوتو لکھ کر رپورٹ کرو میں اسے زیرِ غور لاؤں گی۔ اس طرح میرے ساتھ لڑنے جھگڑنے کا کوئی مطلب نہیں'' مسز ملہوترا ابھی تیز ہوگئی۔

منسکھانی ذرا نرم پڑ گئی ''میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو صبح سات بجے سے پہلے اسکول پہنچنا پڑتا ہے۔ سات بجے سے پہلے نہیں پہنچوں گی تو لیٹ آنے والے اسٹاف کا ریڈ مارک کیسے لگاؤں گی، اور اگر میں ہی وقت پر نہیں پہنچوں گی تو اور کون پہنچے گا، سب بے فکر ہو جائیں گے، اسکول کا ڈسپلن چوپٹ ہو جائے گا۔''

مسز ملہوترا پین کو انگلیوں میں پھنساتی گھماتی چپ چاپ سنتی رہی۔ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی کہ بکے جا۔ مجھے معلوم ہے کیوں تمھارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

''اور سات سے پہلے پہنچنے کے لیے میں چھ بجے نکلتی ہوں ہوسٹل سے۔ چھ بجے نکلنے کے لیے پانچ بجے تو اٹھنا ہی پڑے گا نہ۔ آخر نہانا دھونا، بریک فاسٹ کرنا، کپڑے پہننا سب کچھ ہی تو کرنا ہوتا ہے۔ میں تو کمرہ بھی تقریباً صاف کر کے جاتی ہوں، اپنے بستر کو سیدھا کرنا چادریں تہہ کرنا، بیڈ کو بچھانا، سو کام ہوتے ہیں۔ مہارانی جی تو اپنے کپڑے بھی بکھیرے رہتی ہیں۔ چار چار دن بستر نہیں جھاڑتی جاہل گنوار چھوکری۔ اور اوپر سے آدھی آدھی رات تک۔'' منسکھانی کی آواز غصہ سے کانپ رہی تھی۔

''میں نے کہا نا کہ رٹن کمپلینٹ دے دو۔ اتنے بڑے لیکچر کا کیا فائدہ۔ میں کوشش کروں گی اس کا کمرہ بدلنے کی۔'' اور مسز ملہوترا نے آنکھ گڑا کر منسکھانی کی طرف دیکھا۔ ''اب بول بچو کر دوں اس کا کمرہ تبدیل۔ سالی لیز بین (ہم جنس پرست) مجھے بچی سمجھتی ہے تجھ جیسی ادھیڑ خرانٹ عورتیں میں نے سینکڑوں دیکھی ہیں۔ میں جانتی نہیں تجھے۔ مجھ سے کہیں بھولی ہو تم؟''

منسکھانی اب سچ مچ آپے سے باہر ہوگئی ''کمرہ کیسے چینج کر دو گی تم اس کا۔ اس کا نانا اسے میرے سپرد کر گیا ہے، بیشک پوچھ لینا اس سے۔'' اور وہ پیر پٹکتی باہر نکل گئی۔

بہت زیادہ غصہ میں وہ انگریزی بولتی تھی تا کہ ''یو'' سے کام چل جائے ورنہ ''آپ'' کہنا پڑتا لیکن اس وقت اسے مسز ملہوترا پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ وہ اسے ''آپ'' نہیں کہنا چاہتی تھی۔

اور ''یو'' ذرا ''تو'' سے بھی میل کھاتا ہے۔ نہیں؟

شام ڈھل گئی۔ منسکھانی اندھیرے کمرے میں بیٹھی رہی۔ بتی بھی نہیں جلائی اس نے ساری دنیا اسے ایکدم کمینی اور بے وفا لگ رہی تھی، آنکھ کی شرم تو مر ہی گئی ہے۔ کوئی کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ بس چھین لو جتنا چھین سکتے ہو۔ ہڑپ لو جتنا ہڑپ سکتے ہو، وہ سوچتی رہی۔

''کیسی دنیا ہے یہ کیسے لوگ ہیں اس مردار دنیا میں رہنے والے۔''
''کیا یہ رہنے لائق ہے۔'' بار بار یہی سوال اس کے دل میں گھومتا رہا۔

رات کے وقت جیسے شیشے کی کھڑکی پر کوئی پتنگا پھنس جائے۔ کمرے میں اندھیرا اور باہر روشنی وہ روشنی میں جانا چاہتا ہے۔ شیشہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔ دکھائی دیتی ہے صرف باہر پھیلی وسیع روشنی۔ پیاری روشنی اور وہ بار بار پھر پھر کر کے اس روشنی کی طرف اڑتا ہے۔ اس کا ننھا بدن دھڑام دھڑام شیشہ سے ٹکراتا ہے۔ اس کی ننھی جان رتی رتی حلال ہوتی ہے۔ پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرتے ہیں لیکن اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔

اسی طرح کا ایک پاگل بے وقوف پتنگا منسکھانی کے دماغ میں پھنس گیا تھا، اور سر کی دیواروں کے ساتھ اپنے آپ کو پٹک رہا تھا۔ بار بار پھر پھر لوٹ لوٹ کر وہ کمرے سے نکلی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔

دو منزلہ ہوسٹل کے دو بلاکوں کے بیچوں بیچ گیٹ کے بالکل سامنے اُجاڑ دھرتی کا ایک ٹکڑا تھا۔ زمین کا یہ ٹکڑا جو کافی چوڑا تھا اور دونوں بلاکوں کی پوری لمبائی میں پھیلا ہوا دوسرے سرے پر بنی درزی کی دکان تک چلا گیا تھا جس کے پیچھے باورچی خانہ اور ڈائننگ روم تھا۔ دھرتی کا وہ ٹکڑا اتنا اجاڑ منحوس لگتا جیسے یہ انسانوں کی بستی کا حصہ نہ ہو گویا کسی نے ویران ریگستان سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا ہو۔

اس ویران ریگستان میں اکیلا پن شمشان میں گھومتی روحوں کی طرح بھٹکتا تھا۔ آس پاس کے علاقوں کے ہر کمرے میں اکیلی عورتیں رہتی تھیں، پولٹری فارم میں مرغیوں کے ڈربوں کی طرح اپنے اپنے کمرے میں بند وہ اپنی سنسان زندگی اور اس زندگی کے تمام کڑوے کسیلے واقعات کو سمیٹے جیے جا رہی تھیں۔

یہ تمام عورتیں صبح اپنے کام پر نکلتیں اور شام کو واپس ہوسٹل آ جاتیں، گایوں کے جھنڈ کی طرح۔ کچی گرد آلود راہوں پر اپنے کھروں سے دھول اڑاتی اور اسی دھول میں سانس لیتی ہوئی واپس لوٹ آتیں۔

زیادہ تر عورتوں کے پاس شام کو کہیں جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ باہر کوئی ایسا نہ تھا جو ان سے ملنے کے لیے بیقرار ہو۔ وہ ساری شام ہوسٹل کے بلاکوں کے درمیان پھیلے کچے آنگن میں ہی گھوم پھر کر گزار دیتیں۔ جن لڑکیوں یا عورتوں سے کوئی ملنے آ جاتا اور وہ ان کے ساتھ گیسٹ روم میں بیٹھی ہوتیں ان کے بارے میں باقی سب اکیلی عورتیں آپس میں باتیں کرتیں۔ کڑوی

اور کسیلی باتیں۔ حسد اور بداندیشی سے بھری باتیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ اس طرح کسی عاشق کسی دوست یا کسی بھی مرد سے گھسر پھسر کر ملنے والی سب ہی عورتیں غلیظ ہیں اور وہ خود بڑی پاک صاف اور گایوں جیسی سیدھی سادی ہیں۔

وہ عورتیں اپنی ساتھیوں کی سب سے بڑی دشمن تھیں۔ اپنی ڈھلتی عمر اور اکیلے پن کو وہ پارسائی کا تحفہ سمجھتی تھیں، اور انھیں جو گیسٹ روم میں دوستوں سے مل رہی ہوتیں بڑی نفرت سے دیکھتیں۔

اصل میں ان کی اس نفرت کی وجہ ان کی ویران زندگی تھی۔ زندگی جو پلوں کے نیچے سے تیز رو پانی کی طرح گزرتی جا رہی تھی۔ وہ کسی سنہرے رُوپہلے کل کا خواب دیکھ رہی تھیں کسی ایسے کل کا جو ان کی زندگی کو بدل سکتا تھا۔ لیکن وہ کبھی آیا ہی نہیں، ہر ویران آج، ویران کل میں بدلتا چلا گیا، وقت مٹی بنتا گیا، ویران مٹی اور ویران راکھ کا ڈھیر ان کے آس پاس جمع ہوتا گیا۔

اب وہ اسی ویران مٹی اور ویران ریت کی آڑ میں مصنوعی پارسائی کا جامہ پہنے بیٹھی تھیں، کیونکہ ڈھلتی عمر کی ٹھنڈک بہت ہی ٹھٹھری ہوئی ویران ٹھنڈ تھی۔

منسکھانی اسی ویران سنسان مٹی سے بھرے ٹکڑے پر ٹہل رہی تھی۔ بند گیٹ سے درزی کی دُکان تک اور پھر واپس بند گیٹ کی طرف۔

راج ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

منسکھانی کو ٹہلتے ٹہلتے اپنے بچپن کے دن یاد آنے لگے۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں۔ کیونکہ اس نے ان دنوں کو کوڑے کی طرح جھاڑ کر باہر پھینک رکھا تھا۔ صرف ان کی تلخی کبھی کبھی اس کے دل میں بھٹکنے لگتی۔ راکھ سے ڈھکے کوئلوں کو جب جب تیز ہوا کا جھونکا چھو جاتا راکھ اڑ جاتی اور اندر سے لال انگارے دہکنے لگتے۔

وہ تب بارہ کی بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن اس کا چچا اسے پیچھے والے کمرے میں لے گیا جہاں مہمانوں کے لیے بہت سے بستر اور چارپائیاں پڑی رہتی تھیں، کہنے لگا ''چل تجھے ایک جادو کی چیز دکھاؤں۔''

اور جادو کی جو چیز اس نے دِکھائی وہ سانپ جیسی بھیانک تھی۔ تڑپتی چھٹپٹاتی بچی کو زمین پر پٹک کر اس کے دونوں بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ اس کے جسم میں لوہے کی ہزاروں تپتی سلاخیں اُتار دی تھیں اس نے۔ اتنا ڈر گئی تھی وہ کہ چیخ بھی نہ سکی۔ درد سے اتنی نڈھال ہو گئی کہ رو بھی نہ سکی۔

پھر اس نے پیٹ پر، ناف پر گندہ غلیظ بدبودار کیچڑ محسوس کیا۔ گنگنا اور بے حد لیسدار، بدبودار اور کراہت آمیز۔

بعد میں چچا نے اسے بہت پیار کیا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ کسی کو بتایا تو پیچھے لان میں گڈھا کھود کر اسے اس میں دبا دے گا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

وہ اتنا ڈر گئی کہ اس نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔

اس کے بعد ڈر اور دہشت سے اسے بخار چڑھنے لگا۔ روز بخار میں ہی وہ چوری چوری نہا لیتی پیٹ اور دُکھتے بدن کو رگڑ رگڑ کر دھوتی، رات کو اسے اتنا ڈر لگتا جیسے ابھی چچا آ جائے گا اور اسے پھر نوچ ڈالے گا۔ اسے نیند ہی نہ آتی، نیند آتی بھی تو وہ چونک چونک کر جاگ جاتی۔

اسکول جاتی تو مٹی کا بت بنی بیٹھی رہتی۔ کچھ پلے نہ پڑتا کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔

جب وہ ساتویں میں دوبار فیل ہوگئی تو باپ نے اسے ہوسٹل میں داخل کروا دیا ''گھر رہ کر ماں کے لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے لڑکی کو۔ اچھی بھلی فرسٹ آتی تھی کلاس میں، اور اب دو سال سے مسلسل فیل ہو رہی ہے۔ ہوسٹل میں رہے گی تو سیدھی ہو جائے گی۔''

ہوسٹل میں رہ کر اس کا خوف ختم ہو گیا۔ رات کو گہری نیند سوتی۔ دل لگا کر پڑھتی آٹھویں میں وہ فرسٹ آئی۔

گھر واپس جانے کے لیے اب بھی اس کے باپ کہتے وہ منع کر دیتی ''نہیں بابا اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اچھی طرح پڑھائی کروں تو مجھے ہوسٹل میں رہنے دو۔''

اس کے بعد ساری پڑھائی اس نے ہوسٹل میں ہی رہ کر پوری کی۔

ہوسٹلوں میں رہ کر گھر کے لوگوں سے اس کا دل دور ہوتا گیا۔ خاندان، خاندان کا پیار، ماں باپ کا لاڈ پیار یہ سب اسے صرف کورے الفاظ لگتے کھوکھلے الفاظ، من گڑھت جن کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

چچا نے اس کے دل میں ڈر کی جو پوٹلی باندھ کر رکھی تھی وہی اصلی تھی وہی ٹھوس تھی وہی سچ تھی۔ باقی سب جھوٹ۔

پڑھائی ختم ہوگئی تو گھر کے لوگوں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ کچھ لڑکوں کو گھر بلا کر دیکھنے دِکھانے کی بیکار سی رسم بھی پوری ہوگئی، لیکن منسکھانی کو ہر لڑکے کی خونخوار صورت میں سے چچا کی خونخوار نظریں جھانکتی دکھائی دیتیں اور لگتا سب ہی مرد سوّر ہیں، تیز اور بڑے سینگوں والے بیل اس کا پیٹ پھاڑنے کو تیار اتنے سفید پوش کپڑوں کے پیچھے وہ بھی اتنے ہی بھیانک اور غلیظ ہیں، جتنا اس کا چچا۔

نہیں کوئی لڑکا پسند نہیں آیا اسے۔

گھر میں رہنے کا اس کا دل نہیں کرتا تھا، کیونکہ مشترکہ خاندان تھا اور چچا ابھی وہاں موجود تھا خواہ اب اسے دیکھ کر خود ہی کنی کاٹنے لگا تھا۔

ہر بار چچا کو دیکھ اس کے بدن میں سولی پر چڑھنے جیسی ٹیس ابھرتی۔ چچا کو دیکھ کر اس کے دل میں ہر بار یہی الفاظ اُبھرتے ''ڈیول پگ'' (شیطان، سوٗر)

دہلی کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکریوں کا اشتہار اخبار میں شائع ہوا تو اس نے عرضی دے دی۔ انٹرویو کے لیے بلاوا آ گیا وہ دہلی آ گئی، منتخب ہوگئی، نوکری لگ گئی۔

کتنے سال ہو گئے؟ منسکھانی حساب لگانے لگی، شاید اٹھائیس سال ہوں، اٹھائیس ہو جائیں گے اس اکتوبر میں۔

اٹھائیس سالوں میں وہ اپنے ساتھ اور اپنے نیچے کام کرنے والی ٹیچروں سے روم میٹوں سے محبت تلاش کر رہی تھی۔ محبت جو اس کی جسمانی آگ کو پرسکون بنا دے، جو دل کے زخموں کو پھول بنا دے۔

لیکن بدن کی آگ ابھی بھی اسی طرح دھک دھک جل رہی تھی سوکھی لکڑیوں کے بے لگام شعلوں کی طرح۔

دل کے زخم ابھی بھی ننگے تھے، سرخ اور دُکھتے ہوئے کینسر کے پھوڑوں کی طرح جسے وقت بھرتا نہیں اور زیادہ بھیانک بناتا ہے۔

''ہاؤ ازاٹ آل، اس نے آہ بھری، کسی چیز کا کوئی فائدہ نہیں۔ سب بیکار ہے۔ یہ راج بھی چڑیل، کتیا۔

گھومتے گھومتے تھک گئی تو واپس کمرے میں گئی اندھیرے میں چارپائی پر لیٹی وہ سوچ رہی تھی کہ راج کے ساتھ اگر وہ اسی طرح اکھڑی اکھڑی رہی تو فاصلہ بڑھتا جائے گا اور اگر سچ مچ مسز ملہوترا نے اس کا کمرہ بدل دیا تو اس تابوت جیسے اکیلے کمرے میں وہ کیا کرے گی۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ راج خود ہی مسز ملہوترا سے کچھ کہہ دے۔ یہی کہہ دے کہ میرا کمرہ بدل دو میں بڑھیا سے تنگ آ گئی ہوں۔ پھر کیا ہوگا؟

کیا ہوگا پھر۔

پھر تو کوئی آس نہیں بچے گی۔

اور یہ سالا کیلاش پتہ نہیں کہاں سے آ ٹپکا۔ لیکن اب پھونک مار کر اڑایا تو نہیں جا سکتا اس

کا تو مقابلہ کرنا پڑے گا۔

بھولی بھالی لڑکی ہے۔کوئی بھی مرد اس پر لٹو ہو سکتا ہے۔ ویسے غور سے سوچا جائے تو جوان جسم کے علاوہ ہے ہی کیا اس کے پاس۔ آٹھویں تک پڑھی ہوئی جاہل گنوار، نہ اس نے کبھی اخبار پڑھا ہے نہ اسے پتہ ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ ہوگا کہ ملک کا وزیر اعظم کون ہے۔ احمق کہیں کی۔

جب آئی تھی منہ میں زبان نہیں تھی اس کے۔ دیکھو ذرا اسے یہ سب کس نے سکھایا اور تو اور کپڑے پہننا بھی میں نے ہی اسے سکھایا۔ کتنے ہی نئے کپڑے سلوا کر دیے ہیں۔ کتنی ساڑیاں دی ہیں، اور وہ گلوبند اوہ میں بھی بہت بدھو ہوں، بالکل بے وقوف۔ جذباتی۔ کم سے کم پچیس ہزار تو اڑا چکی ہوں اس پر، صرف اس کے جسم کو چومنے کے لیے؟ اس کے ہونٹوں کو، اور مسکراہٹ کے اندر پھر چنگاریاں اٹھنے لگیں۔ اور چھوٹنے لگی، ایک جوالا اور پھر دھاڑ دھاڑ جلتی آگ میں اس کا سارا غصہ پگھلنے لگا۔ پانی کی طرح۔

وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی کب تک بیٹھا رہے گا یہ کیلاش۔ بس، دو چار آٹھ، دس بار اسے کہیں باہر لے جائے گا۔ سوئے گا اس کے ساتھ اور سارا چاؤ ٹھنڈا ہو جائے گا کیا پتہ ایک بار میں ہی اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے۔

مرد کی ذات کمینی: جو عورت ہاتھ نہ آئے اس کے پیچھے کتے کی طرح بھاگتے ہیں۔ لپلپائی زبان جھنڈے کی طرح لٹکائے ہوئے۔ ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے کہ ترس رہے ہیں تمھارے بدن کے لیے اور جب وہ اپنے آپ کو حوالے کر دے تو اس کے ساتھ سونے کے بعد نہ صرف دکھاوٹی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے عزت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے ساتھ سونے والی ہر عورت کو وہ طوائف سمجھتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اپنی فتح کی لسٹ میں ایک نام اور جوڑ لیتے ہیں۔ ''یہ دیکھو یارو اسے بھی فتح کر لیا میں نے۔ گاڑ دیا جھنڈا اس قلعہ پر بھی۔ اب اگر یہ راج کی بچی پارسا بنی رہی، شرماتی رہی۔ ہر گنوار لڑکی کی طرح اس سے بھی کہتی رہی ''نہیں جی یہ گناہ ہے۔ شادی سے پہلے نہیں۔ پہلے شادی کرو میرے ساتھ پھر بستر، تب تو آج نہیں تو کل اس سے تنگ آ کر وہ بھاگ کھڑا ہوگا، اگر اصلی مرد ہوا تو سالوں سال انتظار ہی کرتا رہے گا۔

اور اگر یہ کتیا اس کے جال میں پھنس گئی۔ پہنچ گئی اس کے بستر پر تب بھی مہینے دو مہینے میں ہی اس کا دل بھر جائے گا اپنے ساتھ اس طرح بے تکلفی سے سو چکی لڑکی کے لیے کون زندگی گنواتا ہے۔

وہ زمانہ اور تھا جب لوگ عشق کی خاطر جان دے دیتے تھے، اور کیا پتہ۔ دیتے بھی تھے یا نہیں۔ ہم نے کون سا جا کر دیکھا ہے۔ قصوں کہانیوں میں پڑھا ہی ہے نا۔ قصے کہانیاں تو دیوتاؤں راکشسوں پریوں کی ہی ہوتی ہیں۔ نہیں؟ جتنی وہ بچی اتنی یہ بچی۔

اس کا مطلب ہے یہ کیلاش والی بلا آخر ٹل ہی جائے گی۔ بھولی بھالی لڑکی ہے۔ بہت دیر تک باندھ کر اسے نہیں رکھ سکے گی، ویسے بھی پڑھا لکھا ہے اچھی نوکری ہے، اچھی تنخواہ ہے موٹر پر آتا ہے، اپنی ہی ہوگی اور کیا ایسے لڑکے کو کیا لڑکیوں کی کمی ہے؟

ویسے بھی ہر ایک کو ویرائٹی (تنوع) چاہیے کیا پتہ یہ کیلاش بھی ویرائٹی کی خاطر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی اس جاہل گنوار کو لیے گھوم رہا ہے۔ لیکن کتنی دیر جی، گڑ کے ساتھ باجرے کی روٹی کھانا کبھی کبھی سمجھ میں آتا ہے۔ رومانٹک بھی لگتا ہے۔ لیکن روز روز کون کھا سکتا ہے، اور وہ بھی تب جب باجرے کی روٹی کھانا مجبوری نہ ہو۔

بس اسے جانے دو، جو طوفان آیا ہے نکل جانے دو، اس کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہیے، کہیں ہاتھ سے ہی نہ نکل جائے۔ بڑے دنوں بعد ایسا نمکین بدن ......

اور منسکھانی کے اندر ہوش کے شعلے پھر تیز ہو گئے، اس نے اپنے جسم کو اپنے ہاتھوں سے دبا لیا اور کروٹ بدل گچھا گچھا ہو گئی۔

وہ راج کے ساتھ پہلے کی طرح ہی لاڈ دلار کرنے لگی۔ صرف اس کے بدن کو وہ ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ سمجھتی تھی کوئی نارمل بدن دو لمس برداشت نہیں کر سکتا۔ پہلے کی طرح وہ اس کے کپڑے دھوبی کو دینے لگی۔ تہہ کر کے سنبھال کر اس کی الماری میں رکھنے لگی، شام کو اس کا انتظار کرنے لگی۔

اسے پتہ لگ گیا تھا کہ راج کو کھچڑی زیادہ پسند نہیں۔ اسے تو پراٹھے اچھے لگتے ہیں، ساتھ چاہے صرف دال ہی ہو، مرچوں کے بگھار والی۔ اس لیے منسکھانی دال سبزی بناتی۔ اپنے لیے پہلے بغیر مرچ کی ایک کٹوری نکال لیتی، اور باقی بچی ہوئی دال میں باریک کٹی ہوئی ہری مرچ کا بگھار لگا دیتی۔

راج بھی خوش تھی کہ منسکھانی اب کیلاش کے نام سے چڑتی نہیں۔ اس کے دیر سے آنے پر ناراض نہیں ہوتی۔ روٹھتی نہیں، اور سب سے بڑی راحت کی بات یہ تھی کہ اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ اپنے غلیظ ہاتھوں سے اس کے گالوں، گردن اور بدن کو بھی نہیں چھوتی تھی۔

اسی طرح دو تین مہینے گزر گئے۔

منسکھانی انتظار کر رہی تھی کہ کب کیلاش کا بادل چھٹے گا۔

ادھر راج انتظار کر رہی تھی کہ کب کیلاش اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرے گا،

کیلاش انتظار کر رہا تھا، کب اس کے دل کی گہرائی سے کوئی واضح پیغام سنائی دے گا۔ ویسے راج اچھی لگتی تھی کیلاش کو لیکن عجیب بات تھی وہ جب بھی اس کی شکل یاد کرنے کی کوشش کرتا تو صرف اس کی ہنسی سنائی دیتی۔ پہاڑی جھرنوں جیسی بے ساختہ ہنسی اوٹ پٹانگ باتوں کے سلسلے سے نکلی بے مطلب ہنسی۔

کیلاش ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ زندگی بھر اسے یہ بے مطلب ہنسی اپنے آس پاس چاہیے بھی یا نہیں۔

کئی بار اسے لگتا زندگی آجکل اتنی بدل گئی ہے کہ لوگوں میں ہنسی کی عادت ہی نہیں رہی ہے۔ کوئی اگر اس طرح ہنستا ہے تو وہ عطیہ ہے، آسمانی جادوئی عطیہ۔

کئی بار اسے لگتا بے مطلب ہنسی اس کی زندگی کو محض مذاق بنا دے گی۔ باقی زندگی وہ کیا کرے گا اگر اسے راج کے ساتھ رہنا پڑا تو صرف اس کی ہنسی سنتا رہے گا؟

دیکھو جی دودھ ابل گیا ہے۔ ہنسی کا جھونکا، دیکھو نا، بے بی نے آپ کی رضائی گیلی کر دی ہے۔ ہائے مر جانی، کتنی شرارتی ہوگئی ہے، ہنسی کی ایک بوچھار۔ دیکھو نا جی یہ سڑیل پڑوسن، دھنیے کی دو پتی کے لیے سبزی والے کے ساتھ لڑ لڑ کر بدحال ہوگئی۔ ہنسی کے چھینٹے، وہ جب بھی گھر سے نکلتی ہے ادھر کے گھر سے وہ لڑکا بالوں میں کنگھی گھماتا گھر سے نکل پڑتا ہے، ویسے سب پاگل ہی بستے ہیں یہاں۔ ہے نا جی؟" ہنسی کی ایک جھنکار، یہ آپ کیا خبریں سنتے رہتے ہو سارا دن۔ چلو نا ذرا باہر گھوم آئیں۔ روٹی کھا کر نہ گھومیں تو پیٹ بھرا رہتا ہے۔ آپ کا تو خیر ہوتا ہی نہیں بھاری پیٹ ہے ہی نہیں آپ کا، ہنسی کا بھرپور چھڑکاؤ۔

اتنی ہنسی کا کیا کرے گا وہ۔

اور صرف ہنسی کا ہی۔

باقی سب کچھ کا کیا ہوگا۔

لیکن یہ تو کمال ہی ہوگیا۔

اس لڑکی کو ذرا ڈھیل کیا دیدی یہ تو ساتویں آسمان پر چڑھ گئی۔

منسکھانی غصہ سے کانپ رہی تھی۔

چپراسی بلا کر لایا تھا اسے کمرے سے "فون ہے میڈم۔"

ساڑھے نو بج چکے تھے۔

راج نے کہا "دیدی، اوشکر ہے آپ آ گئیں، میری تو جان نکل رہی تھی لیکن یہ کیلاش مان ہی نہیں رہے، ضد کر رہے ہیں کہ آج میرے پاس ہی رہ۔"

"پاس رہ؟ کیا مطلب کہاں؟" منسکھانی بوکھلا گئی۔

"یہ سب سویرے آ کر بتاؤں گی۔ بس میری اچھی دیدی۔ آپ کسی کو پتہ مت لگنے دینا کہ رات کو میں ہوسٹل میں نہیں تھی لیکن اگر کسی طرح مسز ملہوترا پتہ لگا ہی لیں تو کہہ دینا، درخواست مجھے دے گئی تھی۔ میں دینا بھول گئی، اس کے نانا جی گاؤں سے آئے ہیں اور اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ رات کو کسی رشتہ دار کے گھر رہیں گے۔"

"نہیں میں یہ سب فریب نہیں کر سکتی۔ اور تمھیں کوئی حق نہیں کہ اب راتیں بھی اپنے یار کے ساتھ گزارنی شروع کر دو۔ اگر اتنی ہی آگ لگی ہوئی ہے دونوں کو، تو شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ میں بتا دوں تمھیں وہ کبھی تمھارے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ یہ سارے مرد سؤر ہوتے ہیں۔ کتے جنگلی کتے۔ وہ تمھاری بوٹی بوٹی کر کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے گا۔ روتی رہو گی ساری عمر، ہوش میں آؤ اور واپس آ جاؤ۔" منسکھانی کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ریسیور والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔

اس کا سارا تحمل ساری قوت برداشت طوفان گزرنے کا چپ چاپ انتظار کرنے کے سارے عزائم ریت کے گولے کی طرح اُڑ رہے تھے، بھربھرا رہے تھے گہرے کنوئیں میں اتر رہے تھے، ہوا کے پاگل پروں پر اُڑتے دُور دراز سنسان کی طرف جا رہے تھے۔ بونڈر بن کر سائیں سائیں کرتی آندھی مسلسل۔

ریسیور کے ماؤتھ پیس کو اس نے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے لپیٹ لیا تا کہ آواز کسی اور کو سنائی نہ دے لیکن اس ہوسٹل میں ہر عورت دوسروں کی بات جاننے کو بیتاب رہتی تھی۔ خاص طور سے یہ سوکھی سڑی ادھیڑ پر کاش جو صرف لوگوں کے فون سن سکنے کے لیے اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے بھی حساب کے رجسٹر کھولے بیٹھی تھی "کتی" منسکھانی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے اس وقت وہ آس پاس سے بے خبر تھی۔ بے خبر اور بے نیاز بھی۔

راج کی آواز فون پر کافی تیز تھی "وہ میرا معاملہ ہے میں اپنے آپ سمجھ لوں گی۔ ساری ایسے ہی آپ کو تکلیف دی کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اپنے آپ کہہ لوں گی۔

منسکھانی کا صبر اب ختم ہو چکا تھا، اپنے آپ کہہ لوں گی کا مطلب؟ مطلب کہ اب اسے کوئی میری ضرورت نہیں۔ گئی یہ۔

ایک کھولتا اندھا غصہ۔ ایک شدید آندھی ایک طوفان۔ گرجتا گڑگڑاتا سب کچھ توڑ

اُکھاڑ پھینکنے کا اعلان کرتا ہوا۔

دہشت خوف اور دونوں سے پیدا ہونے والے غصہ کا کڑکڑاتا طوفان۔

''تم بول کہاں سے رہی ہو۔'' وہ گرجی۔

ٹیلی فون کے دوسری طرف اندھی، بہری، گونگی، خاموشی تھی۔

''کہاں سے بول رہی ہوتم؟ چڑیل، بے شرم، تمھاری ہمت کیسے ہوئی، تم فوراً ہوسٹل آؤ۔ فوراً۔ ساتھ اس حرامزادے کو بھی لے آؤ۔ تمھاری ٹانگ توڑ کر میں اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی، جاؤ لے جاؤ، ان ٹانگوں میں ہی اٹکی ہے نہ تیری جان۔ لے جا ان کو، اور ادھر سے فون بند ہو گیا۔

منسکھانی ایک عجیب بے یقینی میں بوکھلاہٹ میں، غصہ میں کانپتی کھڑی رہی۔ بے جان ریسیور پکڑے، پھر اس نے ریسیور نیچے پٹک دیا۔ اور گھور کر گھنی بیٹھی مس پرکاش کی طرف دیکھا۔

مسز ملہوترا سے وہ شکایت کرنے گئی، چاہتی تھی راج کو بے عزت کر کے ہوسٹل سے نکال دے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں پھڑ پھڑاتی طنز بھری مسکراہٹ دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔

کمرے میں آ کر وہ کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روئی۔

''کمال ہے کسی شوہر کی بیوی اسے چھوڑ کسی عاشق کے ساتھ بھاگ جائے تو سب اس شوہر کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ کسی عورت کا شوہر دوسری عورت کے چکّر میں پڑ جائے تو لوگ اس بیچاری مظلوم عورت کی مدد بغیر مانگے ہی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اور مجھے دیکھو میں اپنی تکلیف کسی کو بتا ہی نہیں سکتی کوئی سمجھے گا ہی نہیں۔

مسز ملہوترا کو دیکھو۔ سارے زمانے کی جھوٹن کتیا۔ سب کو پتہ ہے کہ اس گورنر کی رکھیل ہے۔ اس کے ساتھ سو سو کر اپنے لیے آرام دہ نوکری بھی لے لی اور مفت کا فلیٹ اب اپنی لڑکیوں کو ہتھیار بنا کر استعمال کر رہی ہے اور جب میں بات کرنے لگی تب اس نے کیسے بے عزت کیا مجھے، ہمت تو دیکھو نیچ کی۔ کیسے طنز سے مسکرا رہی تھی دیکھ لوں گی میں اسے بھی۔ کل سے ہی گمنام خطوط بھیجنا شروع کروں گی، وزارت میں مجھے ذلیل کرتی ہے۔

عجیب عجیب خیالات اسے آتے رہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ پھر پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح ہوئی۔

نہ وہ اٹھی، نہ اسکول گئی۔

ایک ایک پل جو گزر رہا تھا اس کے بدن میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اسے پتہ تھا راج کپڑے بدلنے اور تیار ہونے کے لیے ضرور آئے گی، لیکن آئے گی تب جب اس کے حساب سے منسکھانی کب کی اسکول پہونچ چکی ہوگی۔

پونے دس بجے کے قریب وہ آئی راج۔

پونے دس بجے گیٹ پورا چوپٹ کھلا ہوتا ہے۔ کیونکہ دفتر جانے والی لڑکیوں یعنی عورتوں کا یہی وقت تھا اپنے کاموں پر جانے کا۔

پونے دس بجے چوکیدار بھی گیٹ پر نہیں ہوتا۔ سویرے کے ناشتہ سے بچے توس مکھن اور چائے پیتے، وہ کچن کے باورچی کے پاس پہونچا ہوتا ہے۔

پونے دس بجے اس ہوسٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کسی کا خاص دھیان نہیں جاتا تھا۔ اسی لیے اپنی طرف سے وہ بڑا محفوظ وقت دیکھ کر آئی تھی۔

کمرے کا دروازہ پورا کھلا تھا۔

اس کی جان نکل گئی۔

سامنے چارپائی پر کالی اور چنڈی کا روپ لے کر منسکھانی بیٹھی تھی۔ بال بکھرے ہوئے آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی غصہ سے پاگل۔ راج کو دیکھتے ہی وہ جھپٹ کر اٹھی۔ راج دروازے پر ہی حیران اور ہکا بکا سی کھڑی رہی۔ بانہہ سے پکڑ کر منسکھانی نے اسے اندر کمرے میں گھسیٹ لیا۔ اور دروازہ دھڑام سے بند کرلیا۔

پھر اس پر گھونسوں، تھپڑوں، اور ٹھوکروں، کی بارش کردی۔

وہ گلا پھاڑ کر اسے گالیاں دے رہی تھی اور مارتی جارہی تھی۔

راج کو لگتا تھا وہ اپنے آپ کو بچالے گی، لیکن اس طوفان کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ جوان جاٹنی مضبوط ہڈیاں پھر بھی بوکھلا گئی وہ۔ بوکھلایا شخص تو اپنا بچاؤ بھی نہیں کرسکتا۔

''نکال میری مالا۔ واپس کر میری ساری ساڑیاں اور کپڑے واپس کر میرا سب کچھ رانڈ تو اس قابل ہی نہیں تھی۔ میں یونہی تجھے۔

راج کانپتی ہوئی ایک ایک چیز اسے پکڑاتی جارہی تھی اور منسکھانی ان چیزوں کو کمرے میں پھینکتی جارہی تھی۔

''اٹھا اپنا بوریہ بستر اور نکل میرے کمرے سے۔''

اتنی دیر لگاتار باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا جارہا تھا۔ دھڑ دھڑ۔ باہر گلی سے بہت سی آوازوں

کا شور بھی آ رہا تھا۔ لیکن ان دونوں کو کوئی خبر نہیں۔

آخر جب منسکھانی نے دروازہ کھول راج کو باہر دھکیلا تو وہ منہ کے بل برآمدے میں جا گری۔ پیچھے ہی اس کی صندوقچی بھی دھڑاک سے اس پر آ پڑی۔ ہوسٹل کی بہت سی عورتیں تب باہر کھڑی تھیں۔ مسز ملہوترا، مس پرکاش، چوکیدار، درزی اور باورچی سب کھڑے تھے سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ لیکن وہ محض شور تھا۔ تماش بینوں کا شور۔

منسکھانی نے دھڑ سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

راج اپنی صندوقچی پر سر رکھ کر روتی رہی۔ نہ کسی نے اسے اٹھایا نہ ہی چپ کرایا۔ سب ہی تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مسز ملہوترا یہ کہتی ہوئی سیڑھی کی طرف بڑھ گئی "جب رو دھو چکو تو نیچے آ جانا اور بتانا کہ تم کو ہوسٹل میں رہنا ہے۔ یا نہیں۔

○○

بازی گرنی

بھابی جی یعنی کہ میری نانی کو میں جب بھی دیکھتی وہ چولھے کے پاس بیٹھی کچھ نہ کچھ پکا رہی ہوتیں۔

صبح صبح چڑیوں کے چہچہانے سے پہلے وہ جاگ جاتیں۔ نہاتے نہاتے ہی پاٹھ کرلیتیں۔ اور پھر بس وہ ہوتیں اور ان کا باورچی خانہ۔ رات سب کے سوجانے کے بعد بھی ان کے باورچی خانہ میں کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہتیں۔

میں آج بھی بھابی کا تصور ان کے چولھے کے بغیر نہیں کرسکتی۔

پیر مکّی کی گلی لاہور۔

مکان کے اندر داخل ہوتے ہی بڑا سا آنگن بائیں طرف غسل خانہ اور دائیں طرف پاخانہ جسے صرف بھائیاں جی یعنی کہ میرے ناناجی ہی استعمال کرتے تھے۔ بھابی جی کا غسل خانہ پہلی چھت پر اور پاخانہ ادھر کوٹھے پر تھا۔

نیچے بائیں طرف بہت بڑا سا کمرہ جسے سب بیٹھک کہتے تھے۔ چمڑے کے بہت موٹے اور بہت نرم صوفے ایرانی قالین۔ انگیٹھی پر کروشیے سے بنے جھالر والے لمبے انگیٹھی پوش بچھے ہوئے اور اس پر پیتل کے میناکاری گلدان جن میں پھول نہیں تھے ایک طرف کروشیے کی جھالر لگے میز پوش سے ڈھکا میز اور ریڈیو۔

بھائیاں جی کا کافی وقت اسی کمرے میں گزرتا یا پھر گلی کے نکڑ پر، حاجی صاحب کی دکان پر گپ بازی میں یا کبھی کبھار حاجی صاحب کے گھر دعوت پر جو بھابی جی سے چھپ چھپا کر ہوا کرتی تھی۔

ویسے حاجی صاحب بھائیا جی کی روٹی پکانے کے لیے زردہ اور بریانی، ملائی، کباب اور آلو والا گوشت بنانے کے لیے ہمیشہ خاص طور پر ہندو رسوئیا بلاتے جو الگ سے چولھا جلا کر دوسرے برتنوں میں (جو حاجی صاحب نے صرف اپنے جگری دوست یعنی بھائیا جی کے لیے

خاص طور پر الگ الماری میں رکھے ہوئے تھے) کھانا بنا تا حاجی صاحب ہنستے ہوئے کہتے ''لو جی آج ہم بھی پنڈت جی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں گے کیونکہ ہم تو پرہیزگار نہیں ہیں۔''

بھائیاں جی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہتے۔ ''اے بھئی حاجی صاحب ہم کہاں کے پرہیزگار ہیں۔ یہ تو آپ ہی زبردستی۔''

''میں سب جانتا ہوں سردار صاحب۔ بھابی جی سے پٹنے کو تو میں تیار نہیں میں تو گھر بلانے سے بھی ڈرتا ہوں۔ ویسے آپ بھی تو بھابی جی سے لُک چھپ کر ہی آتے ہو۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔''

دونوں ہنستے رہتے۔

کبھی کبھی بھائیا جی مجھے بھی حاجی صاحب کے گھر لے جاتے۔ لیکن راہ میں سمجھاتے جاتے''اگر تو اپنی بھابی جی کو کبھی بتائے گی تو تجھ سے بول چال بند۔''

میں زعفرانی بریانی کے تصور میں کھوئی پھٹا پھٹ وعدہ کر لیتی۔

ویسے بعد میں پتہ لگا کہ ''ہمیشہ کے لیے بول چال بند'' والی دھمکی محض دھمکی ہی نہیں تھی بھائیا جی اصول کے اتنے پکے تھے کہ کئی لوگوں سے بول چال بند کر چکے تھے ان لوگوں میں ان کا ایک سگا بھائی اور بہن بھی شامل تھے۔

بھائیا جی کو جب سے میں جاننے لگی یعنی کہ جاننے لائق عمر کی ہوئی کوئی چار پانچ برس کی، وہ ریٹائرڈ ہو کر آرام کر رہے تھے۔ لیکن جب وہ نوکری کرتے تھے وہ ریلوے میں بہت بڑے افسر تھے۔ اتنے ایماندار اور محنتی کہ پورے ناردرن ریلوے کی ''انوجلیشن'' انھیں مل گئی تھی۔ جگہ جگہ جا کر ریلوے کے اسٹور چیک کرتے دہلی سے لے کر پٹھو کوہاٹ تک ان کا علاقہ تھا۔ انھیں سفر کرنے کے لیے پورے چار ڈبے ملتے ایک سونے بیٹھنے کے لیے ایک باورچی خانے کے لیے ایک بابو اسٹینو ٹائپسٹ اور ایک نوکروں چاکروں کے لیے۔ جیسے کہ کئی لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے قصے سناتے رہتے ہیں۔ بھائیا جی نے ہمیں کبھی بھی یہ نہیں بتایا تھا۔ بھابی جی ہی کبھی کبھار جب سردیوں کے موسم میں سر دھو کر چھت پر بال سکھانے بیٹھتیں اس وقت بھی وہ خالی ہاتھ نہیں بیٹھتی تھیں۔ سویاں بٹتی تھیں اور مجھے بھی سکھاتیں کہ انگلی اور انگوٹھے کے پپوٹے کے ساتھ کس طرح تھوڑا سا نرم گندھے ہوئے میدے کی لوئی میں سے کاٹ کر بلدار سویاں بنائی جاتی ہیں۔ بھائیا جی کے ان لگاتار سفروں کی کہانی سناتیں جب بچوں کی، یعنی میری ماں اور خالاؤں اور ماموں جی کی — چھٹیاں ہوتیں تو سب کو ساتھ لے جاتے تھے جب اس طرح مع خاندان سفر کرنا ہوتا انھیں گاڑی کا ایک اور ڈبہ الاٹ ہو جاتا۔

''اس زمانہ میں انگریز حاکموں کا ڈر تھا اس وجہ سے آج کی طرح لوگ ہاتھ پر ہاتھ نہیں مارتے تھے لیکن پھر بھی کئی جگہ اسٹوروں سے مال کم ملتا۔ بھائیا جی فوراً پکڑ لیتے۔ بھائیا جی کے نیچے کام کرنے والے لوگ بھی ناراض اور اوپر والے بھی کیونکہ بیچ میں ایک بھی آدمی ایماندار آ جائے تو بے ایمانی اور غبن کر کے کھانے پینے کی کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔'' بھابی جی بتاتیں۔

''تیسرے بھائیا جی کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے اگر کوئی انگریز افسر بھی بے ایمان ہوتا اس کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ اس لیے بڑے بڑے افسران کی عزت کرتے تھے۔

اسی عزت کی بدولت بھائیا جی نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ریلوے میں نوکری لگوا دی لیکن وہ تو بے ایمانی کی لمبی کڑی کا ایک حصہ بن گیا۔ بھائیا جی پہلے تو اسے ڈانٹتے پھٹکارتے رہے سمجھاتے رہے۔ لیکن جب اس کے طور طریقے نہیں بدلے سدھرے تو انھوں نے اس سے کہا ''آج سے میں تیرے لیے مر گیا اور تو میرے لیے مر گیا آج کے بعد تو میرے گھر کی دہلیز نہ پار کرنا'' ریلوے کے سب ہی جان پہچان والوں کو اور افسروں کو بھی انھوں نے اعلانیہ کہہ دیا کہ انھوں نے اپنے بھائی سے سب ہی رشتے توڑ لیے ہیں۔ کیونکہ یہ اصول کی لڑائی ہے۔ اور اصول کو وہ جھکنے نہیں دیتے بس ایک ہی بھائی تھا ان کا۔

اور ایک ہی بہن تھی بھائیا جی کی۔ میری ماں کی اکیلی پھوپھی۔ میری ماں بتاتی تھیں کہ جب پھوپھی کی بارات آئی۔ اکیاون ہاتھیوں پر آئی تھی۔ گوجراں والے۔ لڑکی والے دس دن تک باراتیوں کی مہمان نوازی میں لگے رہے۔ اور جب بوا جی کی ڈولی چلی تو ان کے سسر جی نے ڈولی پر سے مہریں لٹائی تھیں۔

لیکن یہ سب سنے سنائے قصے تھے کیونکہ اس بیاہ میں نہ تو بھائیا جی گئے تھے اور نہ ہی اپنے خاندان کے کسی فرد کو انھوں نے جانے دیا تھا۔

''شاید حیثیت سے زیادہ جہیز دینے پر جھگڑا ہوا تھا۔ یا کسی اور وجہ سے یہ تو ٹھیک طرح معلوم نہیں۔ میری ماں بتاتیں۔ مجھے نہیں اپنی بہنوں سے یا کسی دیگر رشتہ دار سے بات کر رہی ہوتیں تو میں چپ چاپ چھپ کر سنتی رہتی مجھ سے تو وہ زیادہ بات ہی نہیں کرتی تھیں۔'' بیوقوف سی تو ہے چھوٹی سی — سوچتی ہوں گی۔

لیکن بچپن کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی خواہ تمھیں سمجھ آئے یا نہ آئے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ پھر بہت مدت بعد جب تم کبھی دل کی درازوں اور کونوں کو ٹٹولتے ہو تو پرانے ٹیلوں میں چھپی چیزوں کی طرح وہ تمھارے سامنے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ بچپن کے تمام چمکدار رنگوں سے رنگین ہو کر مہکتی ہیں نارنجی اور قرمزی رنگ سُرخ اور نیلے رنگ نیبو رنگ اور ہوا پیازی رنگ اور

شہد رنگی روشنی اور سینہ کے اندر پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور خوابوں میں آسمان کے وسط میں اُڑتے پرندوں کی تیرتی پرواز نیلے رنگ کے سمندر میں جو اوپر اوندھا پسرا ہوا ہے۔ مچھلیوں کی طرح تیرتے پرندے۔

کبھی کبھی دل کے ان پرانے ٹیلوں میں ٹھیکرے ٹھیکرے ہوئے برتن بھی ملتے ہیں۔ بہت پُرانے برتن۔ صدیوں پہلے جنھیں تم نے بڑوں کی پُر اسرار باتوں کے اُڑتے اڑتے ٹکڑوں، سرگوشیوں اور ان چھپی چھپی حرکتوں کی مٹی کو گوندھ کر اپنی فینٹیسی کے چاک پر گڑھے تھے جن کا مطلب تم سمجھ نہ سکے تھے۔ خفیہ اور پُراسرار باتیں جنھیں ہم چھپ چھپ کر سنتے ہیں۔ بڑے بوڑھے چاہے جتنا بھی گھوریں اور ڈپٹیں ''بھاگو یہاں سے'' یہ تمھارے کام کی بات نہیں۔ تم پوری طاقت سے پوری عقل سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے۔ کسی اندھیرے کونے میں دُبکے رہتے ہو۔ بہت مدت بعد ان ہی برتنوں کی ٹھیکریاں دل کے ٹیلوں میں ملتی ہیں۔ اور پھر تم ایک ایک نایاب ٹھیکری کو اُٹھا کر جوڑتے ہو اور برتن کو دوبارہ زندگی دیتے ہو۔ چاہے دراروں والی زندگی کیوں نہ ہو۔

یا شاید یہ بات تھی کہ تب اکالی لہر زوروں پر تھی۔ چاہے بھائیا جی انگریز سرکار کی نوکری کرتے تھے اور کسی بھی لہر میں ظاہری طور پر حصہ نہیں لیتے تھے۔ انھوں نے امرت چکھ لیا تھا۔

پھوپھی جی کی سسرال والوں نے کہا تھا کہ شادی ویدک رسم و رواج سے ہوگی بھائیا جی نے اپنے باپو جی سے منع کرنے کو کہا کہ بیاہ گرو رسوم کے مطابق ہی ہوگا اس پر ان کے باپو جی بولے ''ابھی وہ لوگ جو کہتے ہیں ماننا ہی پڑے گا۔ راج گھرانے جیسا ان کا خاندان ہے ان کے سامنے کون اڑ سکتا ہے بعد میں گردوارے لے جا کر ماتھا ٹکوالیں گے۔ اکھنڈ پاٹھ رکھوا کر کیرتن کروادیں گے بھائیا جی نے کہا'' کرلو اپنے آپ شادی۔ میں آج سے ویراں والی (یہ میری ماں کی پھوپھی کا نام تھا) کے لیے مرگیا وہ میرے لیے مرگئی، اب بتاؤ اس میں بیچاری لڑکی کا کیا قصور تھا۔ لیکن نہیں بھائیا جی کے اصول ہی ایسے تھے سیدھی دھار نہ خود ایک قدم اس پرے اِدھر اُدھر ہوتے تھے نہ دوسرے کو ہونے دیتے تھے۔ اگر کوئی ہو جائے تو بس سارے رشتے ختم۔ موت زندگی اُٹھ گئی ''اتنے اونچے گھرانے میں بیاہی گئی ہے ہماری پھوپھی۔ بھائی صاحبوں کے گھر۔ پورے لاہور میں ہی نہیں، ملکوں میں ان کے نام کی شہرت ہے۔ عطر کے تاجر جو ٹھہرے۔ عطر دیس پردیسوں میں جاتا ہے لیکن ہمیں اپنی پھوپھی کی صورت دیکھے بیس سال گزر گئے ہیں۔ اگر آج ان کے بچے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوں تو نہ ہم انھیں پہچان سکتے ہیں نہ وہ ہمیں——''

اور میری ماں آہ بھرتی۔ ''اوہ ہو۔ بھائیا جی نے تو بس آ کر اتنا ہی کہا'' شادی میں کوئی نہیں جائے گا'' بس اتنے ہی لفظ۔ آج تک کوئی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ کیا بات ہوگئی تھی۔ بھابھی جی کو بھی معلوم نہیں۔''

ایسے تھے بھائیا جی۔ میرے نانا۔

بھائیا جی چاہے ریٹائرڈ ہو چکے تھے لیکن بوڑھے نہیں لگتے تھے۔ سوائے دو چار دانتوں کے جو کہ غائب تھے۔ ان کا چہرہ ایک نور سے تمتماتا رہتا۔ سفید کلف دار پگڑی باندھ کر پینٹ اور کوٹ پہن کر وہ ایک رُعب دار مہاراجہ جیسے لگتے۔ ویسے بچپن میں ہر نانا مہاراجہ ہی لگتا ہے۔

لیکن بھابھی جی مجھے کبھی بھی مہارانی کی طرح نہ لگیں۔ ویسے ان کا رنگ بھائیا جی سے زیادہ گورا تھا۔ اور گالوں پر ہلکی سی گلابی جھلک تھی اور آنکھیں سرمئی سی تھیں چوڑا ماتھا گھنے بال جن میں آدھے کالے اور آدھے چاندی کی طرح سفید تھے۔ میں سوچتی ہائے میرے بال بھی کبھی اسی طرح دھوپ چھاؤں کی طرح ہو جائیں تو میں بھی بھابھی کی طرح خوبصورت لگوں۔

لیکن ایسی خوبصورت اور سفید گلابی چہرے والی عورت مجھے ہمیشہ غریب سی لگی۔ تمام دن چولھے کے آگے بیٹھی یا باورچی خانے کی چیزوں کو سنبھالتیں یا دودھ بلوتیں یا پنیاں بناتیں یا بڑیاں توڑتیں یا پاپڑ توڑتیں یا سبزیوں کو موٹے دھاگے سے پرو کر دُھوپ میں سکھاتیں یا میتھی کو چن چن کر موٹی ڈنڈیاں توڑ توڑ کر کوٹھے پر بچھی چارپائیوں پر باریک اور سفید ململ بچھا کر سکھانے کے لیے پھیلاتیں یا لال مرچوں کو دُھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالتیں اور شام کے وقت سمیٹ کر نیچے لاتیں پھر اگلے دن دُھوپ میں پھیلاتیں۔ سوکھ جانے پر پیس کر مرتبان میں سجا کر رکھ دیتیں۔ طرح طرح کے کھٹے میٹھے اچار ڈالتیں، مربے بناتیں۔

سارا دن بھابی جی کچھ نہ کچھ کھانے پکانے کوٹنے پیسنے اور سکھانے کے کام میں مصروف رہتیں۔

تمام دن چولھے میں آگ دہکتی رہتی۔ پہلی منزل پر کافی لمبا چوڑا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کے ایک سرے پر باورچی خانہ تھا۔ سردیوں میں اسی باورچی خانہ میں چولھے کے پاس بیٹھی بھابی جی کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں۔ اور گرمیوں میں اسی برآمدے میں ہی چولھا جلتا رہتا۔ بھابی جی پٹلی پر بیٹھی پنکھے سے پسینہ بھی سکھاتی رہتیں اور ساتھ ہی کھانے پکانے کے کاموں میں بھی جٹی رہتیں۔

رات دھیمی دھیمی آنچ پر کنڈے رکھ کر کھڑے اُڑد یا سرسوں کا ساگ مٹی کی ہنڈیا میں پکنے کے لیے رکھ دیا جاتا۔ صبح تک اس میں سے میٹھی میٹھی اور سوندھی خوشبو آنے لگتی۔

میں آج بھی بھابی جی کو یاد کرتی ہوں تو وہ مجھے چولھے کے آگے بیٹھی نظر آتی ہیں، چاہے بعد میں جب ہم سب دہلی آ گئے اور بھابی جی اور بھائیا جی بھی ماما جی کے ساتھ ان کے افسری بنگلے میں رہنے لگے اور اس کے بعد بھی جب بھائیا جی نہیں رہے اور بھابی جی ماما جی کے ساتھ چنڈی گڑھ چلی گئیں کیونکہ ماما جی کو یہی لگتا تھا کہ تمام عمر اتنے شور غل آپا دھاپی ہی میں گزارنے کے بعد ریٹائرڈ زندگی سکون اور چین اور خاموشی سے جینے کے لیے چنڈی گڑھ ہی سب سے بڑھیا شہر ہے اور بھابی جی اتنی بزرگ ہو گئیں کہ سارا دن یا تو چارپائی پر لیٹی رہتیں یا سردی کے موسم میں کھلی دھوپ میں آرام کرسی پر یا چارپائی پر لیٹی دھوپ سینکتی رہتیں۔ بھابی جی کی کئی اور تصویریں بھی میرے ذہن میں کبھی کبھار اُبھرتی رہتیں لیکن لگتا ہے کہ سب سے زیادہ سچی تصویر وہی ہے۔ چولھے کے آگے بیٹھے رہنے کی اور ہر وقت ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی۔ کھانے پینے کی چیزیں بناتے رہنے کی جیسے کہ ان کی تمام زندگی کا مرکز چولھا اور چولھے پر پکنے والی اور پکانے کے لیے تیار کی جانے والی چیزیں ہی ہوں۔ وہی ان کے جینے کا بہانہ تھا۔

کسی کو بھی یہ سب عجیب نہیں لگتا تھا کہ ایک عورت اپنی تمام زندگی اور دن کے اٹھارہ انیس گھنٹے اپنے خاوند کے پسندیدہ کھانے پکانے میں اور کبھی کبھار آنے والی اپنی بیٹیوں اور ان کے بچوں کے لیے مال پوئے، کچوریاں، حلوا اور کھیر بنانے میں خرچ کر رہی تھی۔ کبھی کبھار ان کے بیٹا بہو پوتے اور پوتیاں بھی آتے۔ ہر ایک کے آنے پر ان میں ایک جوش بھر جاتا۔ جتنا زیادہ جوش اتنا ہی زیادہ کام، اتنی ہی زیادہ کھانے والی چیزیں۔ جب ایک چولھے سے کام نہ چلتا تو دوسرا بھی جلا لیتیں۔ چولھے کے پاس رکھی پیڑھی یا مونڈھا اور اس پر بیٹھی بھابی جی اٹل پرسکون مسکراتی ہوئی۔ گالوں کی ہلکی گلابی چمک کو اِردگرد بکھراتی ہوئی۔

روٹی کا وقت ہوتا تو بھائیا جی نیچے بیٹھک میں سے باہر آ کر اگر اپنے بیڈروم میں آرام کر رہے ہوں، تو وہاں سے باہر آ کر آنگن میں کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دیتے روٹی تیار ہے۔

بھابی جی کہتیں۔ ''آئی جی۔''

اور روٹی نیچے پہنچ جاتی یا اس وقت اگر جھاڑ پونچھ کرنے والی جھاڑو لگانے والی اور برتن مانجھنے والی مہری ہوتو بھابی جی اس کے ساتھ تھالی پروس کر اور دوسرے ہاتھ میں لسی کا لمبا چاندی کا گلاس تھما کے، جس پر مکھن کا پیڑا تیر رہا ہو نیچے بھیج دیتیں اگر منٹوں سیکنڈوں میں وہ نظر نہ آئے یعنی جتنا وقت تھالی پروسنے میں لگتا اتنے وقت میں وہ دِکھائی نہ دیتی تو کھڑاؤں ٹھک ٹھک کھٹکھٹاتی وہ خود نیچے جا کر روٹی دے آتیں۔ نیچے جانے سے پہلے سنوار کر دوپٹہ اوڑھتیں

اور ماتھے تک اپنے سارے بال دوپٹے کے نیچے ڈھانپ لیتیں۔

بھائیا جی ہمیشہ ذرا ڈپٹ کر کہتے۔ ''دو چار منٹ مہری کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ کھڑاؤں کھٹکھٹاتی تم ضرور ایک دن سیڑھیوں سے پھسلو گی اور دھڑام کرکے نیچے آ پڑو گی۔''

بھابی جی ذرا سا مسکراتیں اور کھڑاؤں بجاتی ہوئی واپس سیڑھیاں چڑھ آتیں۔

بھابی جی کا یہی یقین تھا کہ لکڑی کی کھڑاؤں پاک ہوتی ہے۔ چمڑے کے سلیپر چپلیں ناپاک، باورچی خانہ میں صرف کھڑاؤں پہن کر ہی جایا جا سکتا ہے یا ننگے پانو۔ تو سلیپر اور چپلیں وہ صرف ڈیرا صاحب گردوارے جانے کے لیے یا کبھی کبھار ہمارے گھر آنے کے لیے پہنتیں۔ ویسے وہ ہمارے گھر کم آتی جاتی تھیں۔ کبھی برس چھ ماہی جب میری ماں بیمار ہو جاتیں یا میں اور میرا بھائی بیمار ہو جاتے ان کا یہ بھی یقین تھا کہ بیٹیوں کے یہاں زیادہ آنے جانے سے عزت کم ہوتی ہے پانی تو خیر بیٹیوں کے گھر کا ایک بوند بھی نہیں پینا چاہیے۔

چونکہ تمام دن انھیں باورچی خانے میں گزارنا ہوتا تھا اس لیے سارا دن وہ کھڑاؤں ہی پہنے رہتیں۔

بھائیا جی کی تھالی میں وہ ہمیشہ سبزی دال بڑے کٹوروں میں لبالب بھر کر دیتیں اور بھائیا جی کو جتنی کھانا ہوتی رکھ لیتے باقی واپس لوٹا دیتے اسی تھالی میں بھابی جی روٹی کھاتیں۔ میں پوچھتی۔ ''بھابی جی اگر بھائیا جی ساری سبزی کھا لیتے تو کیا آپ روکھی روٹی کھاتیں۔''

''لو ابھی تو پتیلا بھرا پڑا ہے۔'' وہ ہنس پڑتیں۔

''پھر ساری کیسے کھا لیتے۔ مجھے بھلا پتہ نہیں کہ کتنی کھاتے ہیں وہ۔''

''پھر آپ اتنی زیادہ کیوں دیتی ہیں انھیں۔''

''تاکہ وہ واپس کریں اور میں ان کا جھوٹن کھاؤں۔'' وہ پھر ہنس پڑتیں بچوں جیسی معصوم اور شرارت سے چھلچھلاتی ہنسی۔

''لیکن آپ جھوٹی سبزی جھوٹی دال کیوں کھاتی ہو؟''

''اری وکیلن جب تیرا بیاہ ہو گا نا، پھر تجھے پتہ لگے گا کہ مرد کی جھوٹی تھالی میں کھانے سے عورت کو کیا ملتا ہے۔

بس سال میں صرف ایک رات کے لیے وہ مجھے کسی مہارانی کی طرح لگتیں۔ جب میری خالہ کے بچوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو ہوتیں اور انھیں واپس دہلی جانا ہوتا، ان کے جانے سے پہلی رات بھابی جی اندر والا اسٹور کھولتیں۔ اس لمبے چوڑے اسٹور میں اونگھنے سے ٹرنکوں کے تالے گچھے میں پروئی چابیوں کو باری باری آزماتے ہوئے کھولتی جاتیں۔ اور پھر رنگ برنگے

کپڑوں کا چاندی کے برتنوں کا کانسے کے کٹوروں کا بڑے بڑے تھالوں کا اور گدّوں رضائیوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا۔ جس خالہ کو جو بھی پسند آجاتا وہ الگ سے اپنا ڈھیر لگاتی جاتیں۔ ساتھ ہی ڈھیرے ڈھیرے ڈھیرے لگے جاتیں۔ ''بھابی جی اتنی چیزیں اب بس بھی کرو۔'' اور بھابی جی ہنستی ہوئی کہتیں۔ ''اری تیری اس نگوڑی ساس کی نظر دو دن تو نیچی رہے گی۔ دو دن تو کڑوے بول نہ بولے گی۔ یہاں کیا گھٹ جائے گا۔

دستور یہی تھا کہ بچوں کے سو جانے کے بعد ہی اسٹور کھولا جاتا تھا لیکن مجھے اس اسٹور میں چھپی جادوئی دُنیا کا لالچ جگائے رکھتا۔ اسٹور کھلتا تو میں کسی ٹرنک کے پیچھے دُبک جاتی اور دیکھتی ان پیلی دریوں کا جھلملاتے ہوئے دُھوپ اور چھاؤں کے کپڑوں کا کمخواب کے دوپٹوں اور پٹ کی رضائیوں کا مخملوں اور شاہیوں کا میلہ چین کی دو گھوڑوں والی بو سکی جیسے دھیمی آنچ پر پکے دودھ سے اُترتی بالائی ہو۔ چاپی کا لٹھا جو دُمدار کھڑکھڑاہٹ رکھتا مکڑی کے مہین جالے جیسی وائلیں اور ململیں، کروشیے سے بنی لیسیں اور موروں والی دریاں، حیرانی تو اس بات کی ہوتی کہ ہر برس یہ خزانہ اتنے کا اتنا بھرا پرا لگتا۔ مجھے لگتا یہ بھابی جی کا ایسا سمندر ہے کہ جتنے لوٹے چاہو بھر کے لے جاؤ۔ گھڑے بھر کے لے جاؤ بھگوان پھر بارش کرتا ہے ندیاں پھر اپنا پانی اس میں اُنڈیل دیتی ہیں اور سمندر اتنے کا اتنا بھرا رہتا ہے۔

بھابی جی کا جادو کا سمندر۔

بھابی جی اس سمندر کے وسط میں بیٹھ کر کسی مہارانی کی طرح تحفے بانٹ رہی ہوتیں۔

اس اسٹور میں بھایا جی کا کوئی دخل نہیں تھا، نہ ہی ان کی اجازت کی ضرورت تھی صرف یہ کمرہ اور باورچی خانہ بھابی جی کی سلطنت تھی۔ ایک سلطنت میں وہ مہارانی تھیں اور دوسری میں ایک محنت کش عورت لیکن اُنھیں کبھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اُنھیں اپنی دونوں بادشاہتوں پر اتنا ہی ناز تھا اور دونوں سے اُنھیں اتنا ہی سکون ملتا تھا۔

کچھ ایسی ہی مٹی سے اس زمانہ کی مائیں اپنی بیٹیوں کو گڑھتی تھیں۔ بچی کچی گرھست سسرال جا کر مکمل ہو جاتی تھی۔ سارے کنارے بھر جاتے تھے اور چکنا گھڑ برتن باقی رہ جاتا تھا۔ بچے جننے والا، پالنے والا گھر بھونے والا روٹی پکانے والا۔ ساس سسر کی خدمت کرنے والا اور خاوند کی جھوٹی تھالی میں بچی روٹی کو امرت سمجھ کر کھانے والا۔

اور اسی طرح خاوند باورچی خانہ اور اسٹور کی خود مختاری عورت کے سپرد کر کے باقی پوری زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں کس کر پکڑ لیتے تھے، لیکن میں اس طرح صیغۂ ماضی کیوں استعمال کر رہی ہوں۔ تھی۔ تھے۔ اس مالک اور غلام کے رشتوں کی شکل باہر سے کچھ بدل گئی ہو لیکن

آج بھی اندر والے رشتوں کے تانے بانے ان ہی پرانی گھسی پٹی کھڈیوں پہ بُنے جاتے ہیں۔

پیر مٹی کی گلی میں میرے ننھیال کے گھر میں نیچے میں نے بتایا ہی ہے بیٹھک اور بھائیا جی کے سونے کا کمرہ تھا جس میں نقاشی دار دُھوہ والا اور موٹے تراشے ہوئے پایوں والا پلنگ بچھا رہتا تھا جس کی نواڑ ہر مہینے بھابی جی مہری کے ساتھ لگ کر بدلتیں اور دُھلوائی تھیں اور دوسری نواڑ سے ٹھونک ٹھونک کر پلنگ بُن دیتیں۔

وہ پلنگ اتنا بھاری تھا کہ دونوں عورتوں سے ہلتا بھی نہ تھا تو دونوں لٹوؤں کی طرح اس کے گرد گھوم گھوم کر نواڑ لپیٹتیں پھر چوڑائی کی طرف پنڈیاں بنا بنا کر اسے ٹھوک ٹھوک کر کس کس کر بٹھاتیں۔

ہر مہینے پلنگ بُننے کے علاوہ چادروں اور تکیوں کے غلاف ہر چوتھے پانچویں دن بدلنے کے بعد بھائیا جی کے کمرے میں کسی کا بھی داخلہ ممنوع تھا، بھابی جی کا۔ کم از کم ہمیں تو یہی لگتا تھا۔

ہاں جب کبھی ماما جی آتے اور اُنھیں کوئی مردوں والے مسئلے سلجھانے ہوتے تو بھائیا جی اُنھیں اندر والے اپنے سونے والے کمرے میں لے جاتے۔ باہر کی بیٹھک میں پتہ نہیں کس وقت ان کا پوتا یا نواسہ دھڑ دھڑاتا ہوا آ جائے۔

میرا ایک ہی ماما تھا اور تین خالائیں جن میں سے ایک کو تو بہت پہلے اس کے شوہر نے زہر دے کر مار دیا تھا اور بھابی جی بڑی مشکل سے اس زخم کو جھیل پائی تھیں۔

کافی مدّت تک ہمیں یہی پتہ تھا کہ ہمارے ایک ہی ماما ہیں لیکن بعد میں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ غلط تھا۔ ہمارے ایک ماما اور بھی تھے۔

جب پاکستان بننے کے بعد ہم سب اُجڑ کر دلی آ گئے۔ ماما جی کو ریلوے کی نوکری کے بدلہ میں وزارتِ زراعت میں رکھ لیا گیا کیونکہ پورے ملک میں کھانے پینے کی چیزوں کی بہت کمی تھی۔ ریلوے کے پرانے افسر ہونے کی وجہ سے اُنھیں یہ معلوم تھا کہ کہاں سے کونسی چیز ڈھو کر کیسے کس جگہ جلدی سے جلدی پہنچائی جا سکتی ہے۔ اُنھیں خان مارکیٹ کے پاس ایک سرکاری بنگلہ مل گیا جسے اس وقت شان نگر کہتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اُجڑنے کے بعد بھابی جی اور بھائیا جی۔ بھائیا جی جو اتنے خودمختار اور آزاد تھے اور جنھیں اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا اور جن کے گلا کھنکھارنے میں ہی اتنا رُعب تھا کہ چلتا ہوا آدمی سہم کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بے گھر گھاٹ، بے سروسامان اپنے بیٹے کے گھر رہنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔

اس مجبوری کے احساس نے اُنھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا ویسے اُنھوں نے پہلے دن

ہی ماما جی کو یہ کہہ دیا تھا ''تیری چھت کے نیچے ہم ضرور رہیں گے، روٹی اپنی ہی کھائیں گے۔'' کیونکہ وہ بھی اپنے زمانہ میں ریلوے کے بڑے افسر رہ چکے تھے اور ابھی بھی اُنھیں پنشن ملتی تھی۔

چنانچہ بھابی جی کے لیے ڈائننگ رُوم کے پاس چھوٹی سی پینٹری میں باورچی خانہ بنا دیا گیا۔ بھابی جی کو بھی یہ انتظام راس آیا تھا کیونکہ بھابی جی سخت قسم کی سبزی خور تھیں، ساتھ ہی اُنھیں بہت وہم رہتا تھا ہر برتن چار چار بار گھسا جاتا، دھویا جاتا، پونچھا جاتا۔ بھابی جی کے لاہور والے غسل خانہ میں خواہ دو سو برتن تھے لیکن سب ہی اس طرح چمکتے رہتے جیسے مسکرا رہے ہوں اور اب خواہ دس بیس برتن تھے لیکن وہ بھی اسی طرح چمکتے رہتے۔ بھابی جی کہتیں ''اگر برتن ہنستے ہوئے نہ لگے تو بندے سے روٹی روٹھ جاتی ہے۔'' میں سوچتی ہوں بھابی جی کی یہ اپنی شاعری ہے۔

مامی جی زیادہ حقیقت پسند تھیں۔ ان سے یہ سارے وہم نہیں پالے جاتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے بھی موافق تھی کہ بھابی جی الگ باورچی خانے میں الگ کھانا بنائیں لیکن باورچی خانہ اتنا تنگ تھا کہ ایک چولھا اور پیڑھی پر بیٹھی بھابی جی سما سکتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مجھے پتہ لگا کہ میرے ایک اور ماما بھی تھے کیونکہ جب بھائیا جی روٹی کھا کر اپنے کمرے میں جا چکے ہوتے تو ایک بہت خاموش سا غریب سا معصوم سی آنکھوں والا، جیسے بچوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، چپ چاپ بھابی جی سے اپنی تھالی پکڑتا اور چپ چاپ روٹی کھا کر باہر چلا جاتا۔

کافی وقت تک تو میں یہی سوچتی رہی کہ ضرور گردوارے کا بھائی ہوگا کیونکہ گردوارے کے بھائی جی کو روٹی کھلانے کی رِیت لاہور سے چلی آ رہی تھی لیکن ایک دن بھابی جی نے آہ بھر کر کہا ''اری یہ بھی تو تیرا ماما ہے بڑا ماما، اس طرح میرے دو ماما تھے اور یہ بڑے ماما جی اتنے عرصہ سے کہاں غائب تھے اور میری ماں کیوں سب سے یہ کہتی تھیں کہ اس کا بڑے نصیبوں سے صرف ایک ہی بھائی ہے اور بھائیا جی کیوں سب کو یہی کہتے تھے کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے اتنا بڑا افسر بن گیا ہے لیکن ذرا غرور نہیں۔ ایماندار اور محنتی صبح آٹھ بجے دفتر جاتا ہے، جس وقت کوئی چپراسی بھی دفتر میں نہیں آیا ہوتا اور رات کو نو دس بجے واپس آتا ہے۔

اور پھر مجھے وہ دن یاد آتا: لاہور کا دن۔ یاد کی دُھند میں دُھندلایا سا جب ایک بار میں بھابی جی کے ساتھ ڈیرا صاحب گردوارے سے واپس گھر آ رہی تھی بھابی جی لنگر کے وقت تک نہیں رُکی تھیں اور مجھے اس بات کا افسوس تھا۔ گردوارے کے لنگر میں عجیب خوشبودار اور مٹھاس ہوتی تھی۔ لنگر میں اُنھوں نے خدمت بھی انجام دی تھی۔ میں لوئی بنا رہی تھی اور وہ روٹیاں بیل بیل کر بڑے سے توے پر ڈالتی جا رہی تھیں اور کئی دوسری عورتیں بڑی اور لمبی پلیٹوں سے دبا دبا

کر روٹیاں سینکے جا رہی تھیں لیکن لنگر بٹنے سے پہلے ہی وہ مجھے لے کر گردوارے سے باہر آ گئیں۔

''بھابی جی میں لنگر کھاؤں گی۔''

اور کوئی موقع ہوتا تو ہلکا سا ڈپٹ کر کہتیں ''اری پگلی کہتے ہیں لنگر کا پرساد لینا ہے، لنگر تو پرساد ہوتا ہے۔''

لیکن آج وہ خاموش تھیں۔ تیز تیز چل رہی تھیں بس اتنا ہی کہا ''نہیں کام ہے۔ راستہ میں ایک کام ہے۔''

پتہ نہیں کن تنگ گلیوں سے ہم گذر رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ کس کر پکڑ رکھا تھا یا کیا پتہ اُنھوں نے ہی میری انگلی کس کے پکڑ رکھی تھی۔ آج ان کے ہاتھوں کے ہلکے سے لمس کا احساس ہوتا ہے۔

کبھی کبھی میں پوچھتی یہ کون سی گلی ہے تو وہ کہتیں یہ گٹی بازار ہے۔ یہ ڈبی بازار ہے۔

ایک موڑ پر بہت بڑی حویلی تھی ان کے قدم ذرا سا ٹھٹکے۔ ''یہ بھائی صاحبوں کی حویلی ہے۔''

''بھائی صاحب کون؟''

''عطر والے۔'' ان کی آواز اُداس تھی۔ صرف مجھے اس حویلی کے بیرونی موٹے بند دروازے کے اِردگرد سے پھولوں اور عطر کی مہک سی آنے لگی۔

پھر وہ ایک اور پتلی سی گلی میں داخل ہوئیں اور دوپٹے کو ذرا اور سنوار کر اوڑھ لیا۔ ان کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی طرح پھدک پھدک کر آس پاس کے گھروں کی کھڑکیوں اور منڈیروں کی طرف اُڑ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ بھابی جی تھوڑی ڈری اور ذرا سی سہمی ہوئی تھیں۔

پھر وہ ایک مکان کے باہر رکیں۔ دروازے پر لٹکتی ہوئی اور لمبی کنڈی کو پکڑ کر لکڑی کے کواڑ پر کھٹکھٹایا۔ ایک بار، دوبار آہستہ آہستہ۔

دروازہ کھلا۔ سامنے چوڑے جسم والی گول چہرے والی سانولی سی ایک عورت جس کے چہرے پر بہت سی اُداسی گیلی راکھ کی طرح پتی ہوئی تھی، کھڑی تھی وہ چپ چاپ دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی اور میں بھابی جی کے ساتھ اندر چلی گئی اس تنگ سی گلی میں اکیلے بند دروازے کے پیچھے اتنا بڑا آنگن بھی ہوسکتا ہے حیرانی ہوئی۔

ویسے اس آنگن میں بان کی ایک کھٹیا پڑی تھی بس۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا،

آنگن پر چھت نہیں تھی۔ لوہے کی موٹی سلاخوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ اس کے سرے چاروں طرف پھیلے چوکور چھجوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ چھجے پرے سلاخوں کے پار سے نیچے کی طرف جھانکتے دو تین چہرے چھوٹے چھوٹے بچوں کے عام سے چہرے، جن پر نہ بچوں والی اُمنگ تھی نہ حیرانی۔ جیسے وہ ان سلاخوں کے پار چھجوں کے اُوپر اسی طرح ٹکے ہوئے ہوں جس طرح چھجے کے نیچے بیروں میں ان سلاخوں کا آر پار بنا ہوا جال ٹکا ہوا تھا۔

پورے گھر میں کوئی آواز نہیں تھی سوائے پانی کی ایک بوند کے جو رہ رہ کر ٹپک رہی تھی شاید کوئی نل رس رہا تھا۔

بھابی جی نے قمیص کی جیب میں سے ایک رومال نکالا۔ اس کی گانٹھ کھولی اور بہت سارے نوٹ نکال کر اس عورت کو پکڑا دیے۔ وہ نوٹ پکڑ کر ان کی طرف تاکتی رہی لیکن اس کی نظریں اتنی چبھنے والی تھیں گویا وہ نوٹوں کو نہیں ان کے پار اپنے ہی ہاتھوں کو تاک رہی تھیں۔

ایسا سپاٹ چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ غم نہ اُداسی نہ غصہ نہ خوشی نہ احسان مندی، جیسے کہ سارے احساس اس چہرے سے نچوڑ کر کسی نے دُھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دیے ہوں۔

پھر اس نے آہستہ سے کہا ”پانی پیو گی؟“

اچانک پیاس مجھے اپنے گلے میں کانٹے کی طرح اُگی ہوئی محسوس ہوئی۔ گرمی ہی اتنی تھی۔ گرو ارجن دیو کی شہیدی کا گرپورب ہی تو تھا جس کا لنگر بھابی جی نے کھانے نہیں دیا تھا۔ وہی وقت بچا کر وہ آ گئی تھیں اس تنگ گلی میں جہاں ہوا کی آمد و رفت بالکل بند تھی۔

”پلا دے۔“ بھابی جی نے آہ بھر کر کہا۔

وہ عورت دو لمبے پیتل کے گلاسوں میں پانی لے آئی۔ گھڑے کا پانی جس میں سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی پانی پیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ گلاس بھابی جی کے گھر کے گلاسوں جیسے تھے صرف اتنے چمک نہیں رہے تھے۔ اُداس اور بے رنگ لگ رہے تھے۔

پانی پی کر بھابی جی کھڑی ہو گئیں۔ وہ عورت میرے ہاتھ سے گلاس لینے لگی تو بھابی جی نے کہا ”جسونت کور کی بیٹی ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی۔ نہ ہی اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے کہ دوسری عورتیں کرتی تھیں جنھیں بھابی جی بتاتی تھیں۔ ”یہ میری جسونت کور کی بیٹی ہے۔ جتیاں۔ نہ ہی بھابی جی نے میرا نام بتایا نہ ہی اپنی گلابی مسکراہٹ سے مسکرائیں۔

بھابی جی کھڑی ہو گئیں۔ ایک آہ بھر کر اُنھوں نے اُوپر جال کی طرف دیکھا پھر نیچے جھانکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے چہروں کی طرف۔ ایک نظر سے ہی اُنھوں نے جیسے باورچی خانے کو آنگن کی چھت کے جال کو چھجے کو اور چھجے کے پیچھے بنے ان کمروں کو جو نظر نہیں آ رہے

تھے دیکھا۔ ایک عجیب سے جذبے سے جیسے ایک عرصے کے بعد ملے بوڑھے ماں باپ کو دیکھ کر عجیب سی اُداسی اور عجیب سی کیفیت جاگ پڑتی ہے۔ پھر وہ دروازے کے باہر نکل آئیں۔

ان کے ہاتھ میں سے ایک عجیب تناؤ رِس کر میری اُنگلیوں میں داخل ہوا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ان کے ہاتھ کی پکڑ اور کس گئی تھی۔ اب وہ تیز تیز چل رہی تھیں تنگ گلیوں میں جن میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں، اس طرح کی اینٹوں والی گلیاں جن کے دونوں طرف کھلی نالیاں تھیں اور گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ اگر کوئی سامنے سے آتا نظر آئے تو بھابی جی مجھے اپنے آگے کر لیتی تھیں کیونکہ گلی کی چوڑائی میں آمنے سامنے آتے مشکل سے دو آدمیوں کے ساتھ ساتھ ہو کر گزرنے کی گنجائش تھی۔ وہ نہ تو بول رہی تھیں نہ آس پاس کے گھروں کی طرف اور گھروں کے گلی میں کھلتے چھجوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک دُھند میں لپٹی چلی آ رہی تھیں۔

گلی کے گھماؤ دار موڑوں میں سے ہم باہر نکل آئے بھائی دروازہ وہاں سے اُنھوں نے تانگہ لے لیا۔ مجھے اُنھوں نے کس کر اپنے ساتھ چمٹا لیا تا کہ میں تانگے کی پچھلی ڈھلواں سیٹ سے لڑھک نہ جاؤں۔ اُنھیں پتہ تھا کہ تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھنا مجھے اچھا لگتا تھا جس کے آگے چھجہ سا بنا ہوتا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ کے نیچے پسلیوں کے پاس اُٹھتی نرم لہروں کو دیکھا جا سکتا تھا اور گھوڑے کی گردن پر جھولتے بالوں کو اس کے کانوں کو پھیلے ہوئے نتھنوں کو اس کے جسم کی ہر حرکت کو جس میں کسی ہوئی جسمانی طاقت چھپی ہوتی ہے اور جب وہ اپنی دُم کو پیٹھ پر پھٹکارتا تو اس کے سخت بال کبھی کبھی میرے ہاتھوں کو چھو جاتے پھر کوچوان کی اُٹھی ہوئی چابک کو اور اس کی پچکاریوں کو اور پھر عجیب لاڈ بھرے ناموں سے گھوڑے کو مخاطب کر کے اس کی چال میں رفتار لانے کی کوشش کو اور سڑک پر پڑتے اس کے دُمدار پیروں سے پڑنے والی ٹپ ٹپ کو اور چال تیز ہونے سے تانگے والے کی غرور بھری خوشی کو دیکھنے کا اور تجربہ کرنے کا اپنا ہی لطف تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا کیا مزہ تمام راستے پیچھے چھٹتی سلیٹی سڑک کو دیکھے جاؤ اور پیچھے آنے والے تانگوں، سائیکلوں، موٹروں اور بگھیوں کو اور پیدل چلے آ رہے لوگوں کو اور سارے وقت پھسلنے لڑھکنے سے بچنے کے لیے اپنی طرف کے بمبو کو کس کر پکڑے رہو اور اپنا وزن پیچھے کی طرف ہوتا ہوا محسوس کر کے ڈرے جاؤ کہ بے چارے گھوڑے کو پیچھے اُلٹے ہوئے تانگے کا بوجھ کھینچنے میں کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔

لیکن بھابی جی کے کھوئے کھوئے پیلے زرد اور اُداس چہرے کو دیکھ کر میں چپ چاپ ان کے ساتھ چپک کر بیٹھی رہی۔ شاید اس وقت اُنھیں میری ضرورت تھی، ساتھ چپکا کر بٹھانے کی ضرورت تھی۔ ایکدم اکیلی تھیں وہ۔

پتہ نہیں یہ ساری باتیں میرا چھوٹا سا دل دماغ اس وقت محسوس کر رہا تھا یا آج میں ماضی میں پیش آنے والے واقعات ''میگنی فائی'' کر کے دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتہ کون بتا سکتا ہے کہ احساس کی اصلی سچائی کیا چیز ہے۔

پیر کی کی گلی کے ادھر ہی حاجی صاحب کی دُکان سے بھی اُدھر اُنھوں نے تانگہ رُکوایا۔ رُومال کی گانٹھ کھول کر دو آنے تانگے والے کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر کی طرف مڑ گئیں۔ میری انگلی اُنھوں نے اپنی پسینے سے بھیگی سیلی اور نرم سی ہتھیلی میں کس کر پکڑ رکھی تھی۔

ایک عرصہ بعد معلوم نہیں مجھے کیسے پتہ لگا ڈھیرے ڈھیرے کچھ برسوں کے پھیلاؤ پر پھیل کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ بھائی دروازے والا مکان ان کا اپنا مکان تھا۔ بھائیا جی کا موروثی مکان جس میں بھابی جی بیاہ کر آئی تھیں۔ وہاں ہی اسی دروازے کی دہلیز پر ان کی ڈولی کہاروں نے کندھے سے اُتاری تھی اور اسی دہلیز پر کھڑی ہو کر ان کی ساس نے ان کے سر پر سے پانی وار کر پیا تھا۔ اسی گھر میں ان کے پانچ بچے، میرے دونوں ماما اور خالائیں کھیل کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ میری ماں کو تو بھابی جی کے بھائی نے گود لے لیا تھا۔ جب وہ گجرانوالے اپنے میکے جایا کرتی تھیں تو ان کے بھائی نے کہا تھا ''یشودا، اگر اس بار بھی تیرے لڑکا ہوا تو بیشک لے جانا لیکن لڑکی ہوئی تو بھابی کی جھولی میں ڈال دینا۔'' کیونکہ ان کے بیاہ کو بیس سال ہو گئے۔ ہمارے خاندان میں بڑے ماما جی شاید پہلے باغی تھے۔

پہلے تو اُنھوں نے یہ کہہ کر اسکول جانا بند کیا تھا کہ وہاں ہر صبح ''لانگ لِوو دی کوئین'' گانا پڑتا ہے اور وہ کیوں گائیں اس مہارانی کی طویل عمری کی دعا کے گیت جس نے ان کے ملک کو غلام بنا رکھا تھا۔

بھائیا جی گرجے۔ ''اسکول نہیں جائے گا تو کیا کرے گا؟ بھٹے بیچے گا؟''

''انگریزوں کی نوکری کرنے سے وہ بہتر ہے۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

''یہ لڑکا ایک دن ڈاکو بنے گا۔ قتل کرے گا اور تو ہے کہ اسے لاڈ کر کر کے سر پر چڑھائے جا رہی ہے۔'' بھائیا جی کا کھولتا غصہ بھابی جی پر برس پڑتا۔

ماما جی بڑے ہوتے گئے۔ بھائیا جی تو زیادہ تر دورے پر رہتے تھے۔ کبھی بچے اسکول جاتے لیکن ماما جی تیار ہو کر پتہ نہیں کہاں چلے جاتے۔ رات کو گھر لوٹتے روٹی کھاتے اور سو جاتے۔ بھابی جی کوئی بات کرتیں تو چپ رہتے۔ چپ رہنا ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جس سے وہ اپنے آپ کو بچائے رکھتے۔

کوئی بیس برس کے رہے ہوں گے تو بھائی جی اور بھابی جی نے سوچا۔ ویسے سوچا تو

بھائیا جی نے ہی ہوگا کیونکہ سب ہی فیصلے تو بھائیا جی ہی کرتے تھے بھابی جی نے چپ چاپ وہ فیصلہ مان لیا ہوگا کہ ہم اس کا بیاہ کر دیتے ہیں اپنے آپ سدھر جائے گا، تو بیاہ کر دیا اس عورت سے جسے اس دن بھابی جی پیسے دینے گئی تھیں بھائی دروازے کے اوپر پرانے گھر۔

بیاہ کے بعد بھی ماما جی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بھائیا جی انھیں ڈانٹتے۔ ''اب تو کچھ کمانا سیکھ، بال بچے دار ہو گیا ہے۔ وہ کہتے آپ ہی بیاہ کرائے ہو مجھ سے پوچھ کر کرائے تھے۔

گھر میں کشیدگی اتنی بڑھی کہ بھائیا جی نے ایک دن چپ چاپ جا کر پیر مکی کی گلی میں ایک مکان خرید لیا۔ حاجی صاحب نے ہی سودا کروایا تھا۔ وہ اسکول میں بھائیا جی کے ساتھ ہی پڑھتے تھے اور دونوں نے روزی روٹی کے جھمیلوں اور خاندان کی پوری ذمہ داری نبھاتے ہوئے اپنی دوستی قائم رکھی تھی۔ خواہ دو برسوں بعد ملیں انھیں لگتا تھا کہ وقت اتنی دیر تک رُکا رہتا ہے اور پانی ہو کر بہتا تب ہی شروع کرتا ہے جب وہ ملیں اور بیٹھ کر دُکھ سکھ کی باتیں کر رہے ہوں۔

پوری دُنیا میں ایک حاجی صاحب ہی تھے جو بھائیا جی کی دل کی بات سمجھتے تھے اور کسی کے ساتھ وہ دل کی بات کرتے ہی نہ تھے۔ نہ بھابی جی کے ساتھ نہ اپنے بچّوں کے ساتھ جو باپ روزی روٹی کے لیے مہینہ مہینہ دو دو مہینے گھر سے باہر گزاریں انھیں بچے بھی محض مہمان سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ شاید یہ بھی سمجھتے ہوں کہ سیدھی سادی چلتی زندگی میں یہ رُعب داب والا آدمی کبھی کبھی کیوں آ جاتا ہے جس سے ڈر ہی لگتا رہے۔

اس طرح پرانا گھر ماما جی کے حوالے کر دیا گیا۔

''یہ گھر میں نے تجھے دے دیا، یہ کاغذ تیرے نام کر دیے ہیں۔ اب خود کما اور اپنا خاندان سنبھال۔'' لیکن بڑے ماما جی کمائی کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا چاہتے تھے نہ پڑے۔ جو بھی کوئی سمجھاتا یہ کہتے۔ ''میں نے کہا تھا کہ مجھے پیدا کرو، اس ملک میں ایک اور غلام کا اضافہ کرو اور میں نے کب کہا تھا کہ میرا بیاہ کرو۔ انھوں نے ہی (یعنی بھائیا جی نے) سارے جنجال میرے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ وہی نبھائیں میں کیا کروں۔

''لیکن اپنے بچے تو تو نے پیدا کیے ہیں نا۔''

''نہ کرتے میرا بیاہ نہ بچے ہوتے۔ میری شادی کیوں کی تھی، میں نے تو بہت منع کیا تھا، کسی نے میری ایک نہ سنی۔ بیاہ کرو گے تو پوتے پوتیاں تو ہوں گی ہی۔ پالیں اب انھیں بھی۔ انھیں کے لیے تو میرا بیاہ کیا تھا۔ خاندان چلانے کے لیے، چلالیں —— خاندان۔''

بھابی جی کو جب بھی پتہ لگتا کہ بڑی بہو پریشانی میں ہے وہ مہری کے ہاتھ پیسے بھیج دیتیں۔ مہری (ملازمہ) ہی تھی جوان کی ہمراز تھی۔ ان کا درد سمجھتی تھی۔ یہی مہری بھائی والے گھر

میں ان کا کام کیا کرتی تھی اور اس سے پہلے اس کی ماں بھابی جی کی ساس کی خدمت کرتی تھی۔

کبھی کبھار وہ خود جا کر بڑی بہو کو پیسے دے آتیں بھائیا جی سے چھپ کر۔ کہتیں میں تو انھیں بھوکا نہیں مار سکتی نا۔ آخر میرا ہی خون ہے۔ باقی بچوں کی طرح اسے بھی تو میں نے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ اور وہ بھی بیچارہ کیا کرے اپنے بچوں کو کس طرح پالے، اس کے بچوں میں بھی تو میرا ہی خون ہے۔

مہری کہتی۔ ''سب اعمال کا نتیجہ ہیں بی بی۔''

اور دونوں عورتیں اُداسی بھری آہ بھرتیں۔ ان آہوں میں گویا ان دونوں کا درد سمایا ہوتا۔ اگر کوئی دُکھ درد بانٹنے والا نہ ہو تو عورت گھٹ کر ہی مر جائے، ہے نا۔

بھائیا جی اپنا مکان اپنے بڑے بیٹے کو دے کر گھر سے نکلے تو اُنھوں نے کہا۔ آج سے تو میرے لیے مر گیا میں تیرے لیے اور اپنے چھوٹے بیٹے (میرے چھوٹے ماما جی) میری خالاؤں اور میری ماں سے کہا۔ ''اگر تم لوگوں کو مجھ سے رشتہ رکھنا ہے تو یہی سمجھو کہ ہمارے خاندان میں بڑا بیٹا ہی نہیں۔ بیٹیو آج سے تمھارا ایک ہی بھائی ہے، سمجھیں۔''

بیٹیاں بھی سمجھ گئیں اور چھوٹے ماما جی بھی سمجھ گئے۔

اس کے بعد خالاؤں کی شادیاں ہو گئیں۔ ماما جی کو نہ خبر دی گئی نہ ہی وہ آئے۔ چھوٹے ماما جی کی شادی ہوئی، اُنھیں نہیں بلایا گیا۔ بھائیا جی سب سے یہی کہتے میرا ایک ہی بیٹا ہے۔''

اور ہم لوگ یعنی بھائیا جی کے نواسے نواسیاں جب دُنیا میں آئے تو ہمیں یہی پتہ تھا کہ ہمارے صرف ایک ہی ماما ہیں اور پوتے پوتیوں (یعنی چھوٹے ماما جی کے بچوں) کو یہی پتہ تھا کہ ان کے صرف ایک پھوپھی ہی پھوپھی ہے چچا تاؤ کوئی نہیں۔

قیامت تو اس دن برپی جب پاکستان بننے کے بعد ماما جی کے شان نگر والے گھر میں جہاں ابھی سب نکلنے کی کوشش کر رہے تھے بھابی جی بھی اور بھائیا جی بھی ایک دن اچانک بڑے ماما جی نازل ہو گئے۔

بھابی جی سہم گئیں۔ بھائیا جی ابھی اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ تھوڑا سا سو لیتے تھے۔ ''میں ذرا ہلکا سا جھونکا لے لوں۔''

مامی جی اُنھیں پہچان نہ پائیں کیونکہ اُنھوں نے اُنھیں پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ ماما جی دفتر گئے ہوئے تھے اور بچے اسکول۔ مامی جی بھی کھانا کھا کر ضرور سویا کرتی تھیں۔ ہنس کر کہتیں ''بیوٹی سلیپ'' وہ تھیں بھی اتنی خوبصورت کہ بچپن میں لاہور میں میں جب بھی کسی رسالہ میں کسی بہت خوبصورت عورت کی تصویر دیکھتی اس پر انگلی رکھ کر کہتی ''مامی'' بڑی ہوئی تو مامی سے

پوچھتی ''مامی جی آپ اتنی خوبصورت کیسے بن گئیں؟'' سوچتی شاید کوئی ترکیب ہوگی، کوئی راز اگر مجھے بھی معلوم ہو جائے تو میں بھی خوبصورت ہو جاؤں۔ وہ ہمیشہ ہنس کر کہتیں ''بیوٹی سلیپ۔'' دوپہر کھانا کھا کر سو جایا کرو میں بھی نہ کر سکی اور کبھی خوبصورت نہ بن سکی۔

دروازہ بھابی جی نے ہی کھولا۔ سامنے بڑے ماما کھڑے تھے۔ ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس۔ بھابی جی حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ برسوں بعد اور پہلی بار بڑے ماما نے اس گھر میں قدم رکھا تھا جہاں بھائیا جی بھی رہ رہے تھے۔ بھابی جی کچھ بول نہ سکیں، بڑے ماما جی کچھ اجنبی سے لگ رہے تھے۔ ان کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ بھابی جی کا دل چوٹ کھا کر بلکنے لگا۔ ہائے اے بیٹا تو بوڑھا کب ہو گیا، گویا ان کی کوکھ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔

بڑے ماما جی نے دعا سلام کی نہ ست سری اکال کہی، نہ جھک کر بھابی جی کے پیر چھوئے۔ ویسے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کیونکہ انھوں نے عمر بھر کسی کے پیر نہیں چھوئے تھے۔ بس چپ چاپ اندر آ گئے اور ڈائننگ ٹیبل کے نیچے اپنی اٹیچی رکھ دی۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ کوئی صفائی نہیں، کوئی بات چیت نہیں، کوئی کیفیت نہیں۔ ان کا اٹیچی رکھنے کا انداز یہی تھا کہ میں آ گیا، بس میں آ گیا۔

بھابی جی نے بھی چپ چاپ بجھی ہوئی انگیٹھی دوبارہ جلائی۔ چار پراٹھے پکائے اور روٹی ماما جی کے آگے لا کر رکھ دی۔ وہ وہاں ہی بیٹھے تھے ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر۔

بھابی جی سہم رہی تھیں ابھی بھائیا جی اٹھیں گے تو دھکے مار کر بے چارے کو باہر نکال دیں گے۔ ایک قیامت کھڑی کر دیں گے اور رات جب چھوٹا گھر آئے گا تو کیا بنے گا اتنی دیر میں مامی جی بھی اٹھ کر آ گئیں۔ بھابی جی نے نرم لہجہ میں کہا ''بڑا آیا ہے۔''

''کیا کرنے۔'' مامی جی کی آواز میں نہ غصہ تھا نہ جوش، سیدھی سپاٹ آواز۔ ''مجھے کیا پتہ۔ ابھی تو روٹی کھائی ہے اور گم سم بیٹھا ہوا ہے۔ پتہ نہیں اسے یہاں کا پتہ کس نے دیا۔'' بھابی جی مجبوری میں صفائی سی دے رہی تھیں کہ انھوں نے اسے کوئی اتا پتہ نہیں دیا تھا۔ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے خاندان کو لے کر کہاں گیا ہے۔ اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ شاید وہ لوگ امرتسر میں ہیں بڑے ماما جی کا بڑا لڑکا ابھی دسویں میں پڑھتا تھا جب پاکستان بنا لیکن ریفیوجی بچوں کو نوکری دینے کے خصوصی منصوبے کے تحت اسے بھی کہیں راشن کے محکمہ میں نوکری مل گئی تھی۔ امرتسر میں اور سارا خاندان وہاں ہی تھا۔

مامی جی بہت سیانی تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اگر آ ہی گیا ہے تو رہنے کے لیے ہی آیا

ہوگا اور جو رہنا ہی ہے تو روٹی تو ماں ہی بنا کر کھلائے گی مجھے کیا۔

سو انھوں نے بھائیا جی کے اُٹھنے سے پہلے ہی پچھلے برآمدے میں جس کا ایک حصہ لکڑی کی جالی اور چِقوں سے ڈھکا ہوا تھا جہاں بچے شام کو بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے ایک پلنگ بچھا دیا۔ گدا اور چادر بچھا کر تکیہ رکھ دیا اور خاموشی سے بڑے ماما جی کا اٹیچی کیس ڈائننگ ٹیبل کے نیچے سے اُٹھا کر پلنگ کے نیچے سرکا دیا اور انھیں کہا ''آپ آرام کر لو۔''

لیکن بڑے ماما جی کو چھپایا تو نہیں جا سکتا تھا، غائب تو کیا نہیں جا سکتا تھا۔ بھائیا جی کو پتہ تو لگنا ہی تھا، لگا۔ انھوں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کہہ دو جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے، یہاں ہم خود بڑی مشکل سے سر چھپائے بیٹھے ہیں۔ ان کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔''

لیکن تب تک مامی جی نے بہلا پھسلا کر بڑے ماما جی سے اتنا تو اگلوا ہی لیا تھا کہ ان کے کماؤ بیٹے اور ان کی بیوی نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا اور کہا تھا ''وہاں ہی جاؤ جنھوں نے تمھیں بگاڑا اور کسی کام لائق نہیں چھوڑا۔'' ان کے بیٹے نے ہی چھوٹے ماما جی کا پتہ لگا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور دہلی کا ٹکٹ بس وہ دہلی آ گئے۔

انھوں نے اپنے دوپٹے کا پلہ ذرا ماتھے تک نیچے سرکا کر بھائیا جی سے کہا۔ ''اب وہ جائیں بھی کہاں۔ سڑک پر مرنے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔''

سو بھائیا جی چپ ہو گئے۔ بغیر گھر گھاٹ کا آدمی ایسا ہی ہوتا ہے، زندگی کی لڑائی لڑنے کا اس میں دم نہیں رہتا۔ پرائی چھت کے نیچے بیٹھا شخص مٹی کا مادھو بن جاتا ہے، سہما ہوا خاموش دنوں کو دھکے دیتا۔

دن گزرنے لگے، مہینے سال دو سال۔

عجیب خاموشی تھی۔ کوئی بھی بڑے ماما جی سے بات نہ کرتا، کبھی میری خالائیں یا میری ماں اپنے بچوں کو لے کر بھابی جی اور بھائیا جی سے ملنے ماما جی کے گھر آتیں تو انھیں دیکھ کر نظر انداز کر دیتیں اور اندر والے کمرے میں جا بیٹھتیں جہاں بھائیا جی آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھے ہوتے۔ باورچی خانہ میں بھابی جی کے پاس بیٹھنے کی تو جگہ ہی نہیں تھی۔ خود بھابی جی پتہ نہیں کس طرح اپنے جسم کو سمیٹ سکیڑ کر بیٹھی رہتی تھیں۔ ویسے اب ان کا تمام دن باورچی خانہ میں نہیں گزرتا تھا۔ کام کاج ہی کم ہو گئے تھے۔ نہ بڑی کونڈیاں تھیں جن میں بھیگی ہوئی دالیں رگڑی جاتیں، نہ ہاون دستے تھے جن میں کھٹ کھٹ مسالے کوٹے جاتے۔ اب باورچی خانہ کے باہر ڈائننگ روم تک تو ان کا پھیلاؤ پھیل نہیں سکتا تھا۔ اسی چھوٹے سے باورچی خانہ تک سارے کھانے بنانے کو محدود رکھنا پڑتا تھا۔ نہ بڑیاں بنتیں نہ پنیاں، نہ حلوانہ

مال پوڑے نہ پاپڑ نہ اچار مربے۔ بچے کھچے وقت میں وہ گٹکا لے کر پاٹھ کرتی رہتیں گردوارہ پاس ہی تھا لیکن نہیں جاتی تھیں، کیا پتہ بھائیا جی کو کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

اس غریب سے میلی سی سفید داڑھی والے شخص کو جب بھی ہم بھابی جی کے باورچی خانہ کے دروازے کے آگے مونڈھے پر بیٹھ کر روٹی کھاتے دیکھتے ہمیں یہی لگتا بیچارہ گردوارے کا بھائی ہوگا۔ نہ کبھی انھوں نے ہماری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تھا نہ کبھی ہماری کوئی بات کی تھی۔

روٹی کھا کر وہ باہر چلے جاتے۔ ویسے سویرے نکلتے اور دوپہر گھر آتے۔ روٹی کھا کر پھر نکل جاتے رات اس وقت گھر لوٹتے جب انھیں پتہ ہوتا کہ سب لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں پہنچ چکے ہوں گے۔ بھابی جی اپنی پیڑھی پر بیٹھی اونگھتی رہتیں اور ان کا انتظار کرتی رہتیں۔ وہ آتے تو گرم گرم پھلکے بنا کر انھیں کھلاتیں اور ایک عجیب سے اطمینان کا احساس ان کے چہرے پر جھلکتا۔ روٹی کھا کر وہ سیدھے اپنے بستر پر جا لیٹتے جو پہلے دن پچھلے برآمدے میں مامی جی نے ان کے لیے بچھایا تھا۔

بھائیا جی اور بڑے ماما جی ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے نہ پڑیں، وہ ایک دوسرے سے چھپتے رہتے۔

پورے گھر میں تو نہیں، کیونکہ مامی جی مست طبیعت کی تھیں اور بیکار کی جھنجھٹوں میں نہیں پڑتی تھیں اور چھوٹے ماما جی رات دیر سے آتے اور سویرے سویرے دفتر کے لیے نکل جاتے تھے، لیکن بھابی جی اور بھائیا جی اور بڑے ماما جی کے درمیان تناؤ کی سی رسّی تنی رہتی تھی۔ رسّی جس کے سرے غائب تھے۔ یہی لگتا کہ اب کڑک کر کے ٹوٹی کہ جب کڑک کر کے ٹوٹی۔

لیکن بیچ بیچ میں ہوا کے بگلے سے اُٹھتے۔ تنہا بیٹھا شخص سوچے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ بھائیا جی بھی اکیلے بیٹھے سوچتے رہتے ہوں گے۔ ماضی میں ڈوبے چار ڈبوں والی گاڑی میں دُور دراز کے سفر دوست دُشمن حاجی صاحب بھائی دروازے والے گھر اور پیر مکی کی گلی والا گھر۔

جب ٹانگوں میں چلنے کی طاقت نہ ہو، بانہوں میں کام کرنے کا زور نہ رہ جائے، آنکھیں پڑھنے لکھنے سے جواب سی دینے لگیں منہ میں سے ایک ایک کر کے سب ہی دانت جھڑ جائیں اس عمر میں زندگی کے دن کاٹنا ایک بڑی موت سا لگتا ہوگا۔ موت جسے آدمی جیتے جی جھیلتا ہے۔ ایک بار نہیں کئی کئی بار ایسی موتوں میں سے گذرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔

لیکن ہر بار اس کے کنارے بھر بھر کر کے وقت کے بہتے پانی میں گرتے رہتے ہیں۔ کئی بار ذرا سی مٹی کئی بار ایک پورا حصہ ہی۔ کنارے کی ساری مٹی اور پتھر، پیڑ اور پودے تب دریا اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔

دریاؤں کے بھی ٹیلے ہوتے ہیں انسانوں کی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی طرح۔ کھودو تو پتہ لگتا ہے یہاں کبھی انسان بسا کرتے تھے۔ یہ ان کے برتن، یہ ان کے گھر، یہ ان کی ہڈیاں جو اتنے برسوں تک منوں مٹی کے نیچے دبی فاسل (Fosil) کی طرح سخت ہو جاتی ہیں اور یہاں کوئی دریا بہتا تھا کیونکہ منوں مٹی کے نیچے سے نکلی ریت یہ بتاتی ہے کہ اسے تیز بہتے اُمنڈتے پانی اپنے ساتھ بہا کر لائے تھے دُور پار پہاڑوں کی چٹانوں سے اپنے تیز بہاؤ کے ساتھ۔

شنکھ کے ساتھ کان لگا کر سنو تو اس میں سے ساگر کی گرج سنائی دیتی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں برسوں بعد بھی۔

بھائیا جی کے دل میں بھی کئی بار اُبال اُٹھتے ہوں گے۔ پرانی گرج اور وہ بھی بھابی جی سے اُلجھ پڑتے۔ ''تیرے ہی لاڈوں نے اسے بگاڑا ہے۔ اب بوڑھا ہونے لگا ہے، ابھی تک وہی نکماپن، نکماپن اس کی ہڈیوں میں سما گیا ہے۔ جسے پکی پکائی روٹی ملے بھلا وہ کیوں کمائے۔ مفت کی روٹیاں توڑتا ہے، اسے شرم نہیں آتی تو اسے یہاں سے نکالتی کیوں نہیں۔ ابھی تک میری ہڈیاں نچوڑے جاتا ہے گدھ سے بھی برا۔ گدھ مرے آدمی کا گوشت نوچتے ہیں یہ میرے جیتے جی میرا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہے۔ تو ہی ذمہ دار ہے اس کی۔

اور بھابی جی سر جھکا کر سب سنے جاتیں، سب ہی لعنتیں ملامتیں۔

مجھے کئی بار غصہ آتا یا تو بھابی جی بھائیا جی کو اس کا کوئی جواب دیں یا پھر بڑے ماما جی کو گھر سے نکال دیں۔

لیکن بھابی جی شوہر پرستی اور بیٹے کی ممتا — ان دو پاٹوں کے بیچ اکیلے دانے کی طرح پستی رہتیں۔ وہ کبھی بھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔

لیکن کبھی تو دریاؤں کے باندھ بھی ٹوٹ جاتے ہیں، کبھی تو اٹل دِکھنے والی چٹانیں بھی پہاڑوں سے نیچے لڑھک آتی ہیں۔

''لینڈ سلائیڈ۔''

کوئی ایسی ہی بھربھری گھڑی رہی ہوگی جب وہ میری ماں کے آگے رو پڑیں۔ ''یہ کہتے ہیں میرے لاڈ نے اسے بگاڑا ہے۔ اس پیٹ سے میں نے چھ بچے جنے اور کوئی کیوں نہ بگڑا۔ پرکاش تو شہید ہی ہو گئی گھر والے نے زہر دیا تو چپ چاپ کھا کر مر گئی۔ مرتے مرتے بھی اپنا دھرم نہیں چھوڑا۔ پولیس کو بیان نہیں دیا، خاموش مر گئی، تڑپ تڑپ کر اور وہ پھپھک کر رونے لگیں۔

پرانے زخموں میں سے رِستا خون پرانی پرتوں میں دبی ہڈیاں۔

''اگر میں ہی بگاڑتی رہی ہوں تو چھوٹے کو کیوں نہ بگاڑا۔ اگر وہ اتنا بڑا افسر بن گیا ہے، اس کی اتنی عزت ہے تو فخر سے تیرے بھائیاجی سب کو بتاتے ہیں، یہ میرا بیٹا ہے۔ لوگ بھی کہتے ہیں۔ 'کیوں نہ ہو سردار صاحب کا بیٹا ہے جنھیں انگریزی حاکم بھی اُٹھ کر سلام کرتے تھے۔ اگر بچہ اچھا ہو تو باپ کا، اگر بڑے کی طرح کوئی نکما نکل آئے تو وہ ماں کا۔ اندھیر ہے کہ نہیں؟''

میری ماں اُنھیں چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''اور تو بھی جسونت کور تمام عمر بھائیاجی کو خوش کرنے کے لیے یہی کہتی رہی کہ تیرا ایک ہی بھائی ہے۔ دوسرے کو تم سب نے جیتے جی مار دیا۔ تو نے چھوٹے نے بلونت کور نے اوینا ش نے، کسی نے بھی سوچا کہ میرے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ میں نے تم سب کو نو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر پالا ہے، تم سب کو یہی دودھ پلایا ہے۔ تم سب کے گوموت دھوئے ہیں اور میری ساس بوریاں بچھا دیتی تھی جب میرے بچہ ہوتا تھا، کہتی تھی گوموت سے بستر خراب نہ ہونے دوں گی۔ اتنے بڑے گھر میں برس برس بھر بوریوں پر سوتی رہی، کبھی اُف تک نہیں کی۔ تیرے بھائیاجی کو آج تک نہیں پتہ اور میں تم سب میں سے ایک ہی کو بگاڑنے کی چور ہوگئی۔''

''بس کرو بھابی جی گزر گئے وہ وقت۔''

''نہیں گزرے نہیں گزرے۔ میری چھاتی میں آج بھی سلگتے رہے ہیں۔ شاید گزر بھی جاتے اگر میں اتنے برس اس بڑے کی خاطر نہ مرتی رہتی۔ تجھے پتہ ہے لاہور میں بھی اس کے گھر کا خرچ میں ہی دیتی تھی جب سے اس کا بیاہ ہوا ہے اور بھائیاجی نے بھائی دروازے والا گھر چھوڑا ہے میں نے کبھی بھائیاجی کے پیسوں سے اپنا کپڑا نہیں سلوایا۔ میرے بھائی جو بھی دے جاتے، گجرانوالے سے جب بھی آتے اسی سے میں اپنا تن ڈھکتی۔ جو پیسے دے جاتے بڑے کی بہو کو بھجوا دیتی۔ یہی سوچتی تھی کہ اگر میں اپنا خرچ گھٹا کر بڑے کے خاندان کا خرچ چلاتی ہوں تو بھائیاجی کی چوری نہیں۔ اب بھی وہ جب سے آیا ہے میں نے اپنی آدھی روٹی کر دی ہے۔ آدھی بھوکی رہتی ہوں، یہی سوچ کر کہ اپنا پیٹ کاٹ کر اس ''مردود'' کا پیٹ بھر دوں۔ بھائیاجی کے پیسوں پر فالتو بوجھ نہیں ڈالتی پھر بھی وہ میرے چٹکیاں لیتے رہتے ہیں۔ میرا کلیجہ جلاتے رہتے ہیں اور میں ان کے آگے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ساری عمر ان کے آگے بولی نہیں بولنا آتا ہی نہیں۔

پتہ نہیں کس طرح بھائیاجی نے یہ باتیں سن لیں ہمارا خیال تھا وہ سوئے پڑے ہیں۔ لیکن میں باہر آئی تو وہ چپ چاپ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے کرسی پر چھڑی کرسی کے ایک طرف ٹکا کر اور چھڑی کے مٹھ پر ان کا ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ وہ کہیں دور دیکھ رہے تھے جیسے وہ

وہاں غیر حاضر ہوں۔ ہوتے ہوئے بھی نہیں تھے وہاں۔ بہت دور کسی سفر پر گئے ہوں جیسے۔

میں دوڑی دوڑی دوسرے کمرے میں آئی جہاں بھابی جی رو رہی تھیں اور میری ماں انھیں تسلی دے رہی تھی۔

''بھائیا جی تو باہر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے ساری باتیں سن لی ہوں گی اب کیا ہوگا۔'' بھابی جی نے کانپتے کانپتے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں دوپٹہ سنوار کر اوڑھا اور باورچی خانہ میں جا کر چولھا جلانے لگیں۔ میری ماں بھی ڈرتی ڈرتی ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھی دو چار بار بھائیا جی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن بھائیا جی چپ رہے ان کے ہاتھ ان کے ہونٹ ان کی ٹھوڑی دھیرے دھیرے کپکپا رہی تھی۔ ٹھوڑی کانپتی تو داڑھی کے بال بھی لرزنے سے لگتے۔

اس کے چوتھے دن بھائیا جی نے کھانا کھایا اور تھالی لے کر بھابی جی کی طرف چلے۔ دو قدم بڑھائے ہوں گے کہ دھڑام کر کے گر پڑے۔ تھالی اور کٹوری ایک طرف جا گریں اور کچھ دیر اپنی دھات (اسٹیل) کی آواز میں کانپتی رہیں

بھابی جی ہڑبڑا کر پیڑھی پر سے اٹھیں۔ بھائی جی کا سر زمین سے اٹھا کر اپنی بانہوں کے سہارے ٹکا دیا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے سر کو سہلاتی ہے۔ دوسرے کمرے میں سے مامی جی بھی دوڑی آئیں۔

بھائیا جی جا چکے تھے دُور بہت دُور۔

''نہیں ابھی تو انھوں نے کھانا کھایا ہے۔ مجھے تھالی پکڑانے آ رہے تھے چکر آ گیا ہوگا۔'' بھابی جی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

مامی جی نے ماما جی کے دفتر فون کیا۔ ڈاکٹر کو فون کیا۔

ماما جی نے آ کر اپنے ماتحت بابوؤں کی مدد سے بھائیا جی کو بیٹھک میں بچھی سفید چادر پر جو مامی جی نے جھٹ پٹ بچھا دی تھی، لٹا دیا اُوپر بھی ایک سفید چادر اُڑھا دی بھائیا جی آرام سے کمرے کے عین وسط میں زمین پر سو رہے تھے۔

بھابی جی بے تحاشا رو رہی تھیں بار بار یہی کہہ رہی تھیں ''ہائے مجھ سے تو رویا بھی نہیں جاتا۔ ہائے میں اکیلی کیا کروں گی، کہاں جاؤں گی تم وعدہ کر کے مکر گئے۔ تم تو مجھے اپنے کندھوں پر لے جانے کے لیے کہتے تھے اب تم کدھر چل دیے۔''

ہم سب پہنچ چکے تھے۔

ماما جی نے دار جی اور دونوں خالوؤں (موسا جی) سے صلاح کی ''ہاں ٹھیک ہے۔ گھر رکھنے کا تو تب ہی مطلب ہوتا ہے جب کسی کا انتظار ہو، سب ہی تو موجود ہیں۔ سورج ڈھلنے

سے پہلے...... آخری رسوم......"

کسی کو خیال نہیں آیا کہ بڑے ماماجی وہاں موجود نہیں تھے بھائیاجی کا سب سے بڑا بیٹا مجھے لگتا ہے اس وقت شاید بھابی جی کو بھی یہ خیال نہیں آیا یا ہو سکتا ہے کہ آیا بھی ہو اور اس ڈر سے کہ بھائیاجی کا اس آخری گھڑی میں دل نہ دُکھے اُنھوں نے اس خیال کو کتے کی طرح دھتکار کر باہر نکال دیا ہو۔

دل دریا ہوتے ہیں سمندر سے بھی گہرے کون دِلوں کی تھاہ پا سکتا ہے۔

بڑے ماماجی تمام دن گھر نہیں آئے۔

رات کو بھی نہیں۔

اگلے دن بھی نہیں۔

مجھے معلوم تھا جس دن بھائیاجی گزرے تھے — ایک روشن بجتے وقت میں سے گزر کر دوسرے اندھیرے بجتے وقت میں بغیر ڈولے گزر گئے تھے — بڑے ماماجی ضرور دوپہر روٹی کھانے آئے ہوں گے۔ دُور سے ہی اُنھیں بھگدڑ سی ہوتی نظر آئی ہوگی۔ کہیں دُبک کر دیکھتے رہے ہوں گے پھر بھابی جی کے ماتم کرنے کی آوازیں اُنھوں نے سنی ہوں گی۔ اپنی بہنوں کی دہاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں سنی ہوں گی وہ سمجھ گئے ہوں گے اور کہیں چلے گئے ہوں گے، کیا پتہ دو دن کسی گُردوارے میں بیٹھے سوتے رہے ہوں۔

تیسرا دن تھا جب وہ گھر آئے۔

بھابی جی نے اُنھیں دُور سے دیکھا۔

ہمارا خیال تھا وہ ان کے گلے لگ کر روئیں گی۔

لیکن نہیں وہ روتی روتی چپ ہو گئیں۔ بڑے ماماجی کی طرف اُنھوں نے آگ اُگلتی نظر سے دیکھا اور بولیں۔ "چلا جا، چلا جا۔ نکل جا یہاں سے۔ تیری وجہ سے ہی وہ چلے گئے مجھ اکیلی کو چھوڑ کر۔"

وہ عورت جو تمام عمر ایک کسی ہوئی رسّی پر بازیگرنی کی طرح اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھنے کی کوشش میں ساری طاقت اور تمام یکسوئی خرچ کرتی ہوئی چلتی رہی تھی۔ آج زمین پر کھڑی تھی۔ رسّی کے دونوں سرے کبھی ان کے ساس سُسر اور شوہر کے درمیان تنے رہتے تھے۔ کبھی شوہر اور بچوں کے درمیان۔ بہت برسوں سے ایک سرا بھائیاجی کے وجود سے بندھا تھا اور دوسرا سرا بڑے ماماجی کے ساتھ۔ بھائیاجی نہیں رہے تو رسّی کڑک کر کے ٹوٹ گئی۔ بھابی جی چکر کھا کر زمین پر آ گریں۔ زمین پر کھڑا ہونا تو وہ بھول ہی گئی تھیں۔ لڑکھڑاتی کانپتی چکراتی

ہچکولے کھاتی وہ نئے سرے سے چھوٹے بچے کی طرح زمین پر کھڑا ہونا سیکھیں گی۔ شاید چھوٹے ماما جی کا ہاتھ پکڑ کر وہ پیر بڑھانا سیکھیں گی لیکن فی الحال تو وہ چاروں خانے چت گری پڑی تھیں۔

بھائیا جی نہیں رہے تو بڑے ماما جی بھی چلے جائیں۔ چلے جائیں اور انھوں نے دو دو پرانی سونے کی چوڑیاں اپنے ہاتھوں سے اتاریں، انھیں اور وہ چاروں چوڑیاں ماما جی کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیں۔ "بس یہی ہے میرے پاس۔ اسے لے لے اور چلا جا۔ پنشن والے چلے گئے۔ رونق ختم! چولھا بجھ گیا۔ توڑ دیا ہے میں نے چولھا۔ توڑ دیا ہے۔ تو نے سنا چولھا توڑ دیا ہے میں نے چلا جا۔"

اور بڑے ماما جی الٹے پیروں باہر نکل گئے۔

○○

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

سنّاٹے کی چیخ

مسز ملہوترا کی ملاقات جب دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر مہیش چندرا سے ہوئی وہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے راشن محکمہ میں کلرک تھی۔

مہیش چندرا پرانے زمانے کے بچے کھچے آئی سی ایس افسروں میں سے تھے۔ انگریزوں کو سب ہی ناموں کے پیچھے (آ) لگا دینے کی عادت تھی۔ اشوک کو 'اشوکا'، چتر گپت کو ''چتر گپتا'، کرشن کو 'کرشنا'، رام کو 'راما' وغیرہ اسی فیشن کی وجہ سے مہیش چندر نے بھی کسی زمانے میں اپنے نام کو 'مہیش چندرا' بنالیا تھا۔ پھر وہ نام پکا ہو گیا تھا۔

لیکن اب اُنھیں کئی بار کوفت ہوتی اس کمبخت 'آ' کو وہ اپنے نام سے ہٹا کیوں نہیں سکتے، لیکن نہیں ایک بار جو بلا گلے پڑ گئی سو پڑ گئی۔ چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔

ویسے ایسی مصیبت سے چھٹکارا پانے کا اور طریقہ بھی ہوتا ہے جسے دیارام آہوجہ کو اپنے نام میں نکمّے 'دیا' سے دیہاتی بو آئے تو وہ مزے سے ڈی آر آہوجہ ہو جاتا ہے، لیکن مہیش چندرا یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی ذات کافی اُٹ پٹی تھی — کھنڈکر۔ اب وہ ایم سی کھنڈکر سے تو مہیش چندرا ہی بہتر ہے۔

آجکل مہیش چندرا دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ چست درست تھری پیس سوٹ چمکیلے بوٹوں کے رنگ سے میل کھاتی جرابیں اور سوٹ کے رنگ سے میچ کرتی ٹائی اور رومال، پانچ فٹ دو انچ قد اور اس سے تھوڑی سی کم چوڑائی۔

بڑی متاثر کن شخصیت تھی مہیش چندرا کی، ویسے دانشور طبقہ میں یہ بھی مشہور تھا کہ مہیش چندرا بھی ان ہی کی برادری کے ہیں۔ اُنھیں کتابیں پڑھنے اور میوزک سننے کا شوق ہے۔

یعنی ویسے ہی دانشور جیسے یہ ملک پیدا کر سکتا ہے۔

مسز ملہوترا کبھی کبھی ہندی میں کہانیاں لکھتی تھیں۔ رونے دھونے والی عشق اور ناکام محبت، ناس مٹے سماج کی ستائی عورتوں، گھر کے جھنجھٹوں اور نامراد ساسوں کی کہانیاں ویسے ہی

جیسے اکثر عورتیں لکھتی ہیں۔

اپنی طرف سے تو محنت بھی بہت کرتی تھی چار چار بار آٹھ آٹھ بار ٹھیک کرتی پھر ٹائپ کرواتی اور تب اخباروں رسالوں میں بھیجتی لیکن اخباروں، رسالوں کے بگڑے ایڈیٹروں کو تو دیکھو، دو لفظوں کا خط بھی نہیں لکھ سکتے کہ کہانی واپس کیوں بھیج رہے ہیں۔ چھپی ہوئی چٹیں رکھی ہوئی ہیں۔ بس نتھی کیں اور بھیج دیں کہانیاں واپس۔ چھٹی ہوئی۔ واپس بھیجنے میں کون سا مول لگتا ہے۔ ٹکٹ لگا پتے والا لفافہ تو مصنف نے ساتھ ہی بھیجا ہوتا ہے کیونکہ یہی رواج ہے، یہی دستور ہے اور یہی ایڈیٹروں کا تقاضا بھی۔

مسز ملہوترا کو پورا یقین تھا کہ ہر ایڈیٹر نے ضرور کوئی جاہل چپراسی قسم کا آدمی رکھا ہوگا۔ پہلوان ہٹا کٹا جو سب ہی کہانیوں اور منظومات کو بڑی سی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے اور چھاننے میں جو بھی تین چار مکھن کی طرح اوپر آ جائیں انھیں چن کر ایڈیٹر کی میز پر رکھ دیتا ہے اور باقی خود ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ کام ہی کیا رہ جاتا ہے باقی۔ ٹکٹ لگے پتے لکھے لفافے میں بھرو کوڑا کرکٹ تھوک لگا کر لفافے کو چپکا کر بند کر دو اور ڈلوا دو ڈاک پیٹی میں اور یہ ایڈیٹر کیا کرتے ہیں؟ بس حرام کی کھاتے ہیں۔ سارا دن ملنے جلنے والوں سے گپیں لگاتے ہیں۔ چائے کافی پیتے ہیں اور شام کو کہیں نہ کہیں دوستوں کی محفل میں دارو پی کر جھومتے جھامتے رات کو گھر جا پہنچتے ہیں۔ مسز ملہوترا سوچتی۔

اسی لیے تو کوئی ایڈیٹر صبح ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے دفتر نہیں پہنچتا۔ مسز ملہوترا نے کئی ایڈیٹروں کو کئی بار فون کیا تھا۔ بارہ بجے تک ''صاحب تو ابھی آئے نہیں''، بارہ کے بعد ''صاحب میٹنگ میں ہیں''، ایک بجے کے بعد ''صاحب تو لنچ کے لیے باہر گئے ہیں'، دو بجے 'ابھی صاحب لنچ سے واپس نہیں آئے۔'

کام ان کو کیا کرنا ہے۔ خاک اور کرنا بھی کیا ہے کوئی ٹائم ہی نہیں ان کے پاس مسز ملہوترا چڑ جاتی کبھی کبھی کسی ایڈیٹر سے ملنے وہ خود چلی جاتی کسی بھی اخبار کے میگزین سیکشن کے ایڈیٹر کو جو اتوار کے اتوار کہانی چھاپتے ہیں یا کسی ادبی رسالہ کے ایڈیٹر سے ملنے اسے پتہ تھا سب سے اچھا وقت ۳:۳۰ سے ۴:۳۰ بجے کے درمیان ہوتا ہے۔ لنچ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ شراب نوشی کا وقت ابھی دور ہوتا ہے اور ایڈیٹر صاحب اپنی سیٹ پر رونق افروز دوپہر کو اچھی خاصی روٹی کھانے کے بعد آنے والے نیند کے جھونکوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے چائے کافی پیتے ملیں گے۔

اب یہ سب باتیں شروع شروع میں ہی تو پتہ نہیں لگ جاتیں نا! کافی تجربہ چاہیے ان کی

کی معلومات ٹٹولنے کے لیے۔ تو صاف ظاہر ہے۔ مسز ملہوترا کو کہانیاں لکھتے آٹھ دس سال ہو ہی گئے تھے۔

جب بھی وہ کسی ایڈیٹر سے ملنے جاتی ایڈیٹر صاحب نرمی سے اسے اپنے کمرے میں بلا لیتے۔ ظاہر ہے لکھنے لکھانے والی عورتیں مارکیٹ میں کم ہی نظر آتی ہیں اور جو تھوڑی بہت ہیں بھی ان میں سے سب تو ایڈیٹروں کے دروازے نہیں کھٹکھٹاتیں، اگر کوئی آ ہی جائے دروازے پر تو ایڈیٹر اس پر پورا پورا حق ہے۔ خود جو آئی ہے تو چکر کیسے نہیں لگائے گا، اس کے تو فرشتے بھی بلائیں گے۔

پھر مسز ملہوترا تو شکل و صورت سے بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھیں۔ بھرا ہوا گدرایا جسم، قد کچھ چھوٹا تھا لیکن رنگ کافی گورا تھا۔ ناک نقشہ معمولی تھا لیکن گورا رنگ سب کچھ چھپا دیتا ہے۔ اس دیش میں گورے رنگ کا عجیب شوق ہے، اسے کامپلیکس بھی کہہ سکتے ہیں۔

مہیش چندرا کہا کرتے، کئی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ گوری چمڑی والے نے ہم پر دو سو سال حکومت کی ہے تب ہی ہمارے دل میں گورے رنگ کے لیے عزت ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ یہ کامپلیکس تو شاید آریوں نے پیدا کیا ہوگا۔ دراوڑوں کا رنگ کیونکہ سانولا تھا انھیں گھٹیا سمجھنے کے لیے اور سمجھانے کے لیے کہ ہم گوری نسل والے ہیں تم لوگوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں باقی رہی انگریزوں کی بات مجھ پر تو نہیں کیا انھوں نے دو سو سال راج واج مجھ پر تو مشکل سے سو سال کیا ہے۔ وہ ہنستے کیونکہ وہ پنجابی تھے اور اپنے پنجابی ہونے پر انھیں ناز تھا۔ کیونکہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پنجابیت پنجابیوں کی مشترکہ جائیداد تھی مشترکہ وراثت اور مشترکہ قوم۔ ''انگریزوں نے جہاں سارے ملک کی دو سو سال تک ایسی کی تیسی کی وہاں پنجاب کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہوئی ان کی، بعد میں جن بہادر سپوتوں کو انھوں نے جیتا تھا مراٹھے، گورکھے، بہاری، بنگالی اور وہ سب جنھیں اپنی قوت بازو اور تہذیب پر ناز تھا اور آج بھی ہے ان سب کو ساتھ لے کر انھوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ سارے ملک پر دو سو سال حکومت کی اور پنجاب پر مشکل سے سو ایک سال۔''

یوں تو مسز ملہوترا بھی پنجابی تھیں لیکن اسے نہ تو ان باتوں میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی جاننے کا شوق۔

مہیش چندرا اس کے ساتھ اس لیے ایسی باتیں کیا کرتے کیونکہ وہ کہانیاں لکھتی ہے۔ پہلے ہی دن جب اس سے ملاقات ہوئی اس نے یہی کہا تھا۔ ''سر میں نے آپ کی بڑی تعریف سنی ہے، سب کہتے ہیں پہلی بار ایک دانشور دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر بنا ہے۔ میں بھی کتابیں لکھتی

ہوں۔ اپنی کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتی ہوں۔ بہت دنوں سے میری خواہش ہے، میری خوش قسمتی آج آپ سے ملاقات ہوگئی، کب حاضر ہوں سر؟''

سر نے مسکرا کر کہہ دیا ''کل آ جانا کوئی ساڑھے گیارہ بجے سوٹ کرے گا؟''

''بالکل کرے گا سر۔'' مسز ملہوترا خوش ہو کر احسان مندی میں جھکتی جا رہی تھیں۔ مسز ملہوترا کی کوئی کوئی کہانی کبھی کبھی کسی چھوٹی موٹی میگزین میں چھپ جاتی تھی بہت سی واپس چلی آتیں لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی کہانیاں بہت بڑھیا ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے یہ لوگ جونشی پریم چند کی تعریفیں کرتے تھکتے نہیں۔ جیتے جی ان کی کہانیاں بھی اسی طرح واپس بھیجتے ہوں گے یہ سالے ایڈیٹر، ہے کہ نہیں۔

اور ان سالے نقادوں سے کوئی پوچھے، کیا ہے پریم چند کی کہانیوں میں جو میری کہانیوں میں نہیں؟ وہ گاؤں والوں کی مصیبتیں بیان کرتے ہیں اور میں اپنی کہانیوں میں شہری زندگی کی مشکلات کا 'تجزیہ' کرتی ہوں۔ شہری زندگی کی پیچیدگیوں میں پھنسی عورت کی زندگی کے المیہ کا، اب اپنا اپنا فیلڈ ہے۔ بندہ وہی تو لکھے گا جو ''آبزرو'' کرے گا جیسے ماحول میں رہتا ہوگا، ہے نا۔''

''کوئی سمجھتا ہی نہیں۔''

''بے وقوف سالے۔''

مسز ملہوترا اکڑ ھتیں۔

نام کا بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی ماں کا دیا نام (ستیہ وتی) ہی استعمال کرتی رہتی تو دو چار کہانیاں جو چھپی تھیں وہ بھی نہ چھپتیں۔ 'ستیہ وتی' نام تو سونگھ کر ہی ایڈیٹر کا وہ پہلوان چپراسی واپس بھیج دیتا باقی دوسری کہانیوں کے ساتھ ملانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔

لیکن اس نے سمجھداری کی۔ شروع کرتے ہی اپنا نام بدل لیا ''اکا'' کتنا ہلکا پھلکا میوزیکل اور بامعنی نام تھا۔ اکا منہ میں ملائی جیسے گھلتا تھا۔ نہیں بھائی ملائی نہیں، ملائی کون کھاتا ہے آج کل۔ آئس کریم کی طرح گھلتا ہے منہ میں۔ مسز اکا ملہوترا سوچتی اور مسکراتی۔

آخر میں مسز ملہوترا نے سوچا اگر میگزینوں میں نہیں چھپ رہی تو یہ ان میگزینوں کا ہی نقصان ہے۔ اچھی چیز چھاپتے نہیں بس سفارشی لوگوں کی تخلیقات ٹھونک دیتے ہیں احمق سالے۔

''رسالے تو چلیں گے ہی کیونکہ یہ سب کسی بڑے اخبار کے گروپ کا حصہ ہیں۔ ہر کوئی کسی بڑے گروپ انڈسٹریل ایمپائر کا حصہ ہے۔ اپنے ہی اشتہارات اپنے ہی پرچے انکم ٹیکس سے پیسے بچائے دوسری طرف خرچ کر دیے۔ جب بھی فائدہ ہی فائدہ سارے سیاستداں دیکھ لیں

سیاست اور بڑے بزنس ہاؤسز کا گوشت اور خون کا حصہ ہے۔'' مہیش چندرا نے اسے بتایا تھا۔

اور یہ بہت بعد کی بات ہے۔

جس وقت کی بات آپ کو بتا رہی ہوں۔ الکا تب تک مہیش چندرا کے 'آرٹ' میں نہیں آئی تھی۔ مہیش چندرا کی شخصیت اور ان کی چکا چوند کرنے والی دانشورانہ سوجھ بوجھ ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کے 'آرٹ' میں بہت سے چاند سورج ستارے گردش کرتے ہی رہتے تھے تو مسز الکا ملہوترا نے سوچا کیوں نہ وہ ساری مطبوعہ غیر مطبوعہ کہانیاں پبلشر کے پاس لے جائیں۔ ایک کتاب چھپ جائے تو مصنف کی پکی جگہ بن جاتی ہے پھر ہے کہ نہیں۔

اور اس نے پبلشروں کے چکر لگانے شروع کیے۔ ہر پبلشر اسے شائستگی سے چائے پلاتا اور مسودہ رکھ لیتا۔ ''ہمارے ایڈیٹر اسے پڑھیں گے پھر آپ کو کچھ بتا سکتے ہیں۔'' سب ہی پبلشر جواب دینے میں ہی پانچ چھ مہینے لگا دیتے۔ مسز الکا ملہوترا تنگ آ گئی اور اس نے فیصلہ کیا پراویڈنٹ فنڈ سے پیسہ نکال کر کتاب خود ہی چھپوا لے۔

اور کتاب چھپ گئی۔

پھر وہ اپنی کتاب کی نقل لے کر ہر نقاد کے پاس گئی۔ بڑی عجیب مسکراہٹ سے کتاب پیش کر کے وہ کہتی۔ ''بس اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننی ہے۔'' اپنی کتاب لے کر وہ مہیش چندرا کے پاس جا حاضر ہوئی۔

مہیش چندرا کے ساتھ ہوئی ملاقات ایک عجیب اتفاق ہی تھا۔ ٹائمز آف انڈیا والے تلک مارگ والے اپنی بڑی سی کوٹھی میں ہر سال ادبی سیمینار کرتے تھے۔ اس سیمینار میں سیاسی رہنما سرکاری افسر اور کبھی داؤ لگ جائے تو لیفٹیننٹ گورنر کو شامل کرنے میں کامیابی مل جاتی۔ کوٹھی کے باہر لمبے چوڑے لاؤنج میں چاروں طرف کنارے کنارے چھوٹی چھوٹی رنگین چھولداریوں کے نیچے طرح طرح کی دکانیں سی سجا دی جاتیں۔ چائے، کافی، پکوڑے، سموسے، چاٹ، دہی بھلے، بھنے آلو، مٹر کی چاٹ، جلیبی، قلفی، مٹھائیاں سب کے چھوٹے چھوٹے خونچے سے لگا دیے جاتے۔ بس گھوموا اور کھاتے جاؤ۔ گھوموا اور اہم لوگوں سے ملتے رہو۔

مصنف نقادوں کے پاس گھومتے رہتے اور منیجر سرکاری افسروں اور سیاسی رہنماؤں کے آس پاس منڈلاتے رہتے۔

یہ بڑی شائستہ اور مہذب قسم کی ''پبلک ریلیشن'' کی تقریب ہوتی۔ مسز الکا ملہوترا نے اس بار کسی طرح تقریب میں شامل ہونے کا دعوت نامہ ہتھیا لیا۔ وہیں اسے مہیش چندرا سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن وہ ساڑھے گیارہ بجے اپنی کتاب نذر کرنے گورنر ہاؤس جا

پہنچی۔ پی اے نے فہرست دیکھی اور کہا ''لیکن آپ کا نام تو آج کے اپائنٹمنٹ میں نہیں ہے۔''

مسز ملہوترا نے بڑے دھڑلے سے جواب دیا۔ ''اپائنٹمنٹ تو میں نے لیا ہی نہیں وہ تو گورنر صاحب نے مجھے خود بلایا ہے آج ساڑھے گیارہ بجے۔

پی اے نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور پھر چیٹ پر اس کا نام لکھوا کر اندر چلا گیا۔ صاحب نے اندر بلالیا۔ مسز ملہوترا ساڑی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

مہیش چندرا کو دنیا کی ہر عورت میں دلچسپی تھی، خاص طور سے ان عورتوں میں جن کا رنگ گورا ہو کیونکہ ان کا اپنا رنگ بہت سانولا تھا۔ اور اس طرح الکا ان کے وسیع چاند تاروں کے اس جھرمٹ میں آملی جوان کے دائرے میں چکر لگاتے رہتے تھے۔

ہر سورج کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ خلا میں پھیلا ایک وسیع دائرہ لاکھوں کروڑوں میلوں میں پھیلا ہوا جس میں اس سورج کی کشش میں بندھے تارے چکر لگاتے ہیں، اس سورج کے اردگرد۔

مہیش چندرا کے لیے یہ دوستی صرف ایک کارنامہ اور چھوٹی سی فتح ہی تھی۔ گویا عظیم سلطنت کے بادشاہ نے ایک چھوٹے سے گاؤں کو جیت کر اپنی سلطنت میں ملالیا ہو۔ ملا لینے کے کارنامے کا سکھ لیکن الکا ملہوترا کے لیے یہ ایسی سیڑھی تھی جو اسے ادنیٰ متوسط طبقہ کی گھٹتی ہوئی بے رس اور کوفت سے بھری ہوئی ویران زندگی کی دلدل سے تھوڑا اوپر لے جاسکتی تھی جہاں سانس آتی جاتی رہے۔

چوتھی پانچویں ملاقات میں ہی اس نے مہیش چندرا سے کہا کہ وہ دفتر کی اس نوکری سے تنگ آچکی ہے۔ راشن کا دفتر بھی کوئی دفتر ہوا، اس جیسی انٹلیکچول اور پڑھنے لکھنے والی عورت کے لیے ایسی بیہودہ نوکری۔ دل اور دماغ کے سارے پرزے ہل جاتے ہیں سارا دن۔ ایسا کام جس میں سارا دن ایک بھی عقلمند ماتھے نہ لگے، ہڈیوں کے اندر کی نرم سی ''مجا'' بھی چوس لیتا ہے۔ ساتھ ہی کام کرنے والے بھی ''جاہل''۔ کام تو کوئی کرتا ہی نہیں ویسے، بس سب کے سب میز کے نیچے سے سرک آنے والے نوٹوں کے انتظار میں رہتے ہیں۔ مہیش چندرا بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سنتے رہے۔ ''آپ کے ہسبینڈ کیا کرتے ہیں؟''

''کرنا کیا ہے؟ اتفاق کی بات ہے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو ہیں نہیں۔ رمیش نگر کی کسی دکان پر ''سیلز مین'' ہیں۔ الکا روہانسی سی ہوگئی۔ اس ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے، کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ بعد میں دونوں میں نبھے گی یا نہیں۔ بس جو بھی مل گیا باندھ دیا اس کے ساتھ۔'' پرس میں سے رومال نکال کر اس نے آنکھیں پونچھیں۔ ''میں دیکھتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ کوئی آسان

سی نوکری...... کسی ایسی جگہ ٹرانسفر کی کوشش کرتا ہوں جہاں کام کم ہو اور تمھیں پڑھنے لکھنے کا زیادہ موقع ملے۔''

الکا ملہوترا خوش بخوش ہوگئی۔ ''تھینک یو سر۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

بھولنے ہی نہیں دوں گا میں۔ کوئی دہلی سے باہر تو نہیں بھیج رہا تمھیں۔ یہیں رکھوں گا تاکہ تم مجھ سے ملتی رہو اور احسان نہ بھول سکو۔'' مہیش چندرا ہنستے رہے۔

کچھ دن بعد انھوں نے الکا سے کہا۔ ''مسز ملہوترا۔''

''سر ایک ریکوئسٹ ہے۔ آپ مجھے مسز ملہوترا نہ کہیں الکا کہا کریں۔''

ٹھیک ہے۔ اب تمھارے لیے ایک جگہ دیکھی ہے لڑکیوں کا ہوسٹل ہے ورکنگ گرلس ہوسٹل اس کی وارڈن بنا دیتا ہوں۔ ابھی جو وارڈن ہے اس کا کہیں اور ٹرانسفر کروا دوں گا۔ تنخواہ تو خیر وارڈن کے گریڈ کے مطابق ہی ہوگی لیکن اور کافی سہولیات ہیں۔ ہوسٹل میں ہی رہنے کا کمرہ مل جائے گا۔ ابھی تو تمھارے پاس کرایہ کا ہے نا، وہ کرایہ بچے گا۔ ہوسٹل کی کینٹین کا کھانا بھی اس نوکری میں شامل ہے مفت، کام بھی کوئی خاص نہیں۔ سب ہی کام کاجی عورتیں ہیں۔ صبح کام پر نکلتی ہوں گی شام کو واپس آتی ہوں گی۔ ہاں ایک بات ہے یہ ہوسٹل سینٹرل گورنمنٹ کے تحت ہے۔ تمھارا راشن دفتر ہے دہلی انتظامیہ کے تحت تو کوئی جگاڑ بٹھانا پڑے گا وقت تو تھوڑا لگے گا باقی رہی تنخواہ کی بات وہ تمھیں سینٹرل گورنمنٹ سے آن ڈیپوٹیشن بھیج دیں گے۔ ڈیپوٹیشن کا کچھ الگ الاؤنس ملتا ہے اس حساب سے تمھاری تنخواہ بھی کچھ نہ کچھ بڑھے گی۔

''لیکن ایک کمرے میں میرا پورا خاندان......''

''خاندان۔ وہ تو میں بھول ہی گیا کبھی پوچھا ہی نہیں تم سے۔ کتنے بچے ہیں۔''

''جی دو لڑکیاں ہیں۔''

''ہوں۔'' مہیش چندرا کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ ''میرے خیال سے اس کی کوئی پرابلم نہیں ہونا چاہیے۔ جب تمھیں ٹرانسفر آرڈر ملیں ڈیپوٹیشن پر جانے کے آرڈر، تب تم ایک درخواست لکھ دینا کہ وارڈن کو دو کمرے ملنا چاہیے۔ اس ملک میں اور کسی کا پیٹ بھرے نہ بھرے قاتل کا پیٹ بھرنا ہی پڑتا ہے۔'' وہ ہنسنے لگے ''ٹھیک ہے سر۔''

''اور تب تک تم ہوسٹل کا ایک چکر لگا آؤ۔ دیکھ آؤ کہ کس جگہ ہے، کس طرح کا کام ہے لیکن کسی سے کہنا کچھ نہیں کیونکہ اس ملک میں گدوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کوئی اور نہ اڑا لے یہ

پوسٹ۔ میں تو صرف دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر ہوں ملک کا پرائم منسٹر نہیں۔ سفارشیں کرنے والے بھی لاکھوں میں اور سننے والے بھی، سارے کام زبانی سفارشوں سے تو نہیں ہو سکتے نا۔ اچھی پوسٹیں لوگ خرید بھی لیتے ہیں۔'' وہ مسکرا رہے تھے کسی ہمہ داں کی طرح۔ مسز ملہوترا دوسرے دن ہی چکر لگانے ہوسٹل جا پہنچی۔ وارڈن سے اس نے کہا کہ اپنے لیے اسے ایک کمرہ چاہیے۔ دہلی میں ابھی اس کی پکی نوکری نہیں لگی بس لگنے ہی والی ہے۔ آج لگے چاہے کل ذرا وہ ہوسٹل کے کمرے دیکھ لے باقی انتظام بھی روٹی وغیرہ۔

ہوسٹل کی پرانے زمانہ کی عمارت کے کمرے کافی کھلے اور ہوادار تھے۔ اونچی چھتوں والے۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ وارڈن کا رہنے والا کمرہ گیٹ کے دائیں طرف کا پہلا کمرہ تھا اور دفتر کا کمرہ گیٹ میں گھستے ہی بائیں طرف۔

لیکن اصلی مصیبت غسل خانوں کی تھی۔ کمروں کی لمبی قطار کے بیچوں بیچ چار چار میلے کچیلے غسل خانے سانجھے۔

''ربش۔'' الکا ملہوترا نے ناک بھوں سکیڑی۔

پھر وہ ٹہلتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف گئی۔ ڈائننگ ہال میں لکڑی کی میلی لمبی میز اور ڈھیچوں ڈھیچوں کرتی ہوئی کرسیاں تھیں چاروں طرف ویران بدحواس اُداسی تھی بس۔

اس نے فیصلہ کیا کہ آرڈر ملتے ہیں وہ جو درخواست لکھے گی اس میں صاف لکھ دے گی کہ ایک غسل خانہ وہ صرف اپنے لیے تالہ لگا کر رکھے گی دو کمرے اور ایک غسل خانہ۔ باورچی خانہ میں کام کرنے والی ایک مائی تو ہے ہی دو باورچی بھی ہیں۔ باورچی اگر وارڈن کے لیے اس کے کمرے میں روٹی نہیں پکائیں گے یا مائی وارڈن کے کمرے صاف نہیں کرے گی تو وہ ان حرام خوروں کو بدل دے گی افسر کا کام تو کرنا ہی پڑے گا نہیں تو جائیں گے کہاں۔

باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی ''فیوچر کنگڈم'' یعنی کل پرسوں فتح ہونے والی سلطنت پر ڈالی اور تسلی سے مسکراتے ہوئے باہر نکل آئی۔ مبیش چندرا کو جا کر اس نے بتایا۔ خوش تھی شکرگزار تھی۔

مبیش صاحب مسکرا رہے تھے۔ ''اُدے پور کا پروگرام پھر پکا ہے؟''

''بالکل پکا سر۔'' الکا نے سولہ سالہ بچی کی طرح شرما کر نظریں جھکائے آہستہ مسکراتے ہوئے کہا۔

کم سے کم عورت کو اپنی عمر کے مطابق برتاؤ کرنا تو آنا ہی چاہیے۔ گانٹھ باندھ لی اور بس چلتے چلے گئے۔ سولہویں سے ساٹھویں تک۔ یا خدا عقل بخش ان عورتوں کو مردوں کو جیتنے کا

ایک ہی ہتھیار بھر دیا تو نے ان کے دماغ میں۔ اتنی کنجوسی اچھی نہیں۔ بھگوان مہیش چندرا سوچ رہے تھے۔ مہیش چندرا آئی سی ایس ایل جی۔

''لیکن ایک دقّت ہوگی وہاں۔ دن رات عورتیں ہی عورتیں۔ چوبیسوں گھنٹے چڑ چڑی ادھیڑ عورتوں سے گھری رہوگی۔ مشکل نہیں ہوگی؟'' مہیش چندرا شرارت سے مسکرائے۔

''مشکل کیوں ہوگی سر؟ آپ جو ہیں۔''

وہ پھر جھینپی پھر مسکرائی۔

''بے وقوف ایڈیٹ؟'' مہیش نے دل ہی دل میں کہا۔

''اور وہ تمھارا شوہر؟''

''وہ تو سر کتنے ہی سال ہوگئے، ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ میرا مطلب ہے (نظریں جھکی ہوئی۔ چہرے پر بے حساب صدمہ زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا۔ گھبراہٹ گہرا دکھ کا سایہ وغیرہ) کوئی جسمانی تعلق نہیں مہیش چندرا نے عینک کے پار ایکسرے نظر سے الکا کو دیکھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر چائے آ گئی۔

چائے پیتے مہیش چندرا کہنے لگے۔ ''میں سوچ رہا تھا اس ہوسٹل میں زیادہ تر عورتیں شاید اسکولوں کی ٹیچریں ہوں گی۔ اس دیش میں عورتوں کے لیے یہی محفوظ پیشے سمجھے جاتے ہیں۔ ٹیچنگ، نرسنگ، ڈاکٹری وغیرہ۔ نرسوں اور ڈاکٹروں کو تو اسپتالوں میں ہی رہنے کی جگہ مل جاتی ہے۔ وہ بھلا اس ہوسٹل میں کیوں آئیں گی اگر وہ کسی اعلیٰ پروفیشن میں ہیں۔ جیسے ہوٹلوں کی ریسپشنسٹ یا ایئر ہوسٹس یا اسی طرح کے اونچے پایہ کے پروفیشن، تب بھی وہ اس تھرڈ کلاس ہوسٹل میں نہیں رہیں گی۔ اس ہوسٹل میں میرا خیال ہے زیادہ تر ٹیچریں ہی ہوں گی۔ صبح الارم لگا کر اُٹھنے والی۔ اب بھلا جو شخص صبح کی میٹھی نیند میں الارم سے ہڑ بڑا کر اُٹھے گا وہ سارا دن ہر ایک سے چڑ چڑائے گا نہیں تو کیا کرے گا۔''

اور مجھ جیسی بے چاری کلرک قسم کی عورتیں بھی تو ہوں گی وہ جب اپنے کام سے خوش ہوں گی تو چڑ چڑاتی رہیں گی۔'' الکا نے مسکرا کر کہا۔

''تو اس چڑ چڑاتے چڑیا گھر سے تنگ تو نہیں آ جاؤ گی۔''

''تنگ آ کر آپ کے پاس آجایا کروں گی نہ'' پھر وہی شرمیلی مسکراہٹ۔

''ایڈیٹ۔ کوڑ مغز۔ پھر کہتی ہے میں کہانیاں لکھتی ہوں'' مہیش چندر نے اکڑ کر سوچا

پھر انھیں یاد آیا کہ پہلے دن ہی جب ملنے آئی تھی کتاب بھی دے گئی تھی بلکہ کتاب ہی تو دینے آئی تھی۔ وہ کتاب کہاں پھینک دی انھوں نے۔ کور بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ویسے انھیں اندازہ تھا کہ اس کتاب میں کیا ہوگا آخر پرانے وقت کے آئی سی ایس تھے۔ اتنا بھی نہ سمجھتے تو حکومت کیسے کرتے۔ اب جو بھی کہو وہ دہلی شہر کے راجہ تو تھے ہی اور اس کا انھیں پورا احساس تھا۔

نبیش چندرا میں خواہ کوئی اور خوبی نہ ہو وہ سودے میں ڈنڈی کبھی نہیں مارتے تھے۔ کسی بے چاری کے ساتھ اگر شام یا رات گزارتے تو کیا ہوا وعدہ پورا نبھاتے باقی مردوں کی طرح یہ بھی نہیں کہ پانچ سات شامیں یا راتیں گذار کر اس سے بور ہو جائیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ مرد کی جیب میں عورتوں کی بہت ساری ریزگاری ہر وقت موجود رہنی چاہیے چاہے بوجھ سے جیب ہی نہ پھٹ جائے۔ اس کی انھیں کوئی فکر نہ تھی۔

ان کا اصول تھا کہ ہر عورت خواہ خوش مزاج ہو یا سڑیل ہو، عقلمند یا بے وقوف ہو، حسین یا کم حسین ہو سب کو سنبھال کر رکھو پچھلے جنم میں وہ بے شک پٹیالہ کے کسی پرانے راجہ جیسے کوئی راجہ رہے ہوں گے یا کیا پتہ ان کی رگوں میں کسی ایسے ہی راجہ مہاراجہ کے خون کا حصہ ملا ہو۔

ایک چھوٹا موٹا حرم ہی تھا ان کا۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ سارے حرم کو انھوں نے بالکل کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ حرم میں شامل کی گئی بیگموں یا مہارانیوں کی رکھوالی کے لیے نہ ہیجڑے تھے اور نہ اونچی دیواریں جاؤ عیش کرو۔ دنیا بھر کے مردوں کے ساتھ سوؤ۔ لیکن جب میں آواز لگاؤں فوراً آجاؤ (یہی اصول تھا ان کا) اور بدلہ میں جو میرے بوتے میں ہو لے جاؤ۔ نوکری، مکان، دکان، لائسنس، بچوں کا پروموشن، انڈسٹریل پلاٹ، سب۔

وعدے کے مطابق انھوں نے مسز اکا ملہوترا کو ورکنگ گرلس ہوسٹل کی وارڈن بنا دیا۔ آن ڈیپوٹیشن۔ ڈیپوٹیشن الاؤنس الگ، دو کمرے جنھیں مسز ملہوترا سوئیٹ کہتی تھی۔ دو کمروں کے پچھلے گلیارے کو اس نے دونوں طرف لکڑی کی الماریاں رکھوا کر بند کر دیا تھا اور وہاں کچن بنالیا تھا۔ کچن کا کام کرنے اور روٹی پکانے کے لیے کینٹین کے باورچیوں کی باری باری ڈیوٹی لگ گئی۔ برتن مانجھنے اور جھاڑو پونچھا کرنے کے لیے کینٹین کی مائی تھی ہی۔ ایک غسل خانہ کو تالہ لگا دیا گیا۔ یہ وارڈن میم صاحب کا پرائیویٹ ٹائلیٹ ہے ایک لیٹرین کی بھی تالہ بندی ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی پٹیوں پر ''پرائیویٹ'' لکھ کر دونوں دروازوں پر ٹھونک دیا گیا۔

مسز ملہوترا اپنی دونوں لڑکیوں کو ایک عدد شوہر کو اور سامان کو لے کر ہوسٹل کے اپنے سوئیٹ میں آکر جم گئی۔ پچھلا سارا فرنیچر وہ بیچ آئی تھی کیونکہ ہوسٹل میں اس کا سوئیٹ فرنشڈ تھا۔ نئے پردوں، صوفوں پر چڑھانے کے لیے ٹیپسٹی اور ضروری فرنیچر کے لیے ہوسٹل کا کنٹی جینسی فنڈ تو

تھا ہی وہ تھی ہوسٹل کی اعلیٰ ترین افسر جس کا پورا اور واحد حق بنتا تھا اس فنڈ پر اس کے سوئیٹ اور دفتر کے بیچ وہی اجاڑ سنسان مٹی سے بھرا ٹکڑا تھا بس جب دل چاہتا اپنے کمرے سے ٹہلتی ہوئی نکلتی اور دفتر میں اپنے سنگھاسن پر جا بیٹھتی۔

ایک اس کی اسسٹنٹ بھی تھی مس پرکاش۔ سوکھی سڑی گئی سی ادھیڑ عورت جس کے منہ پر ہی لکھا تھا کہ بھری دُنیا سے اسے خالی ہاتھ جانا پڑے گا اور اس طرح خالی ہاتھ بھیجے جانے کے لیے اس دنیا کو وہ کبھی معاف نہیں کریں گی۔

مس پرکاش کا کام تھا سب کے بل بنانا، کرائے لینا سرکاری خزانہ میں جمع کروانا ہوسٹل کے سارے اسٹاف کی تنخواہ اور چھٹیوں کا حساب کتاب رکھنا۔ سرکاری خزانہ سے پیسے نکلوانا سب کو تنخواہ دینا دونوں بلاؤں کی جمعدارنیوں کو بھی کبھی کس کر ڈانٹ دینا کیونکہ غسل خانے اور لیٹرین ہمیشہ گندے ہی رہتے تھے۔ دونوں جمعدارنیں رنگ برنگی چوڑیاں کھنکھناتی یا تو اپنی کنگھی پٹی کرتی رہتیں یا آپس میں کہیں لڑاتی رہتیں۔ موقع لگتا تو آنکھ بچا کر کھسک بھی جاتیں۔ سوچتیں ہم کیا کریں ڈھیر کی ڈھیر یہ عورتیں اور ان سب کا میلا صاف کرنے کے لیے بس یہ دو جنیں، جسے صفائی کی ضرورت ہوئی نہانے سے پہلے اپنے آپ جھاڑو لگا لے گی۔ فلش میں فینائل ڈال لے گی، بہت سی عورتیں ایسا ہی کرتی بھی تھیں۔ اب جن فلشوں کا اینمل ہی گھس گیا ہو، سیٹوں میں درازیں ہوں وہ گندی تو لگیں گی ہی۔ جن غسل خانوں کے فرش کے سیمنٹ ہی ٹوٹے ہوں، دیواروں پر مدتوں سے قلعی نہیں ہوئی ہو انھیں وہ کیسے چمکا لیں گی۔ آخر انھیں جھاڑو ہی تو دینی ہے سرکار کوئی جادو کی چھڑی تو دیتی نہیں ہے کہ نہیں۔ کبھی کبھار ان سب کی ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے علاوہ مس پرکاش کے کام میں کچن کا حساب کتاب بھی شامل تھا ویسے جہاں دو باورچی اور ایک کام کرنے والی عورت موجود ہو وہاں کھانے پینے کی چیزوں کا حساب کتاب رکھنا بھگوان کے سینہ سے راز نکال لینے سے کم نہیں۔ فرض کیا ۳۰/افراد روٹی کھاتے ہیں تو یہ کون دیکھے گا ان کی دال میں دانے کتنے ہیں اور پانی کتنا اور جھگڑا ہوتا اور جھڑپیں ہوتیں کوئی نہ کوئی عورت ہوسٹل میں روٹی کھانا بند کرتی رہتی لیکن جھنجھٹ سے بچنے کے لیے اگلے مہینے دوبارہ شروع کر دیتی۔

روٹی پکانا بھی بڑا اُداس کرنے والا کام ہے خاص کر جب اکیلے آدمی کو صرف اپنے لیے روٹی پکانی ہو وہ بھی شام کو جب سارا دن زندگی کی جنگ لڑ، تھکی ہاری چڑچڑی اس پریشان سے ویران ماحول میں واپس آتیں تب صرف اپنے لیے روٹی پکانا سخت بد دُعا لگتی۔

دوبارہ جب وہ کینٹین جوائن کرتیں تو باورچی انھیں طنز بھری نظروں سے دیکھتے، اُتر گیا

نشہ۔ کھالی پکا کر کھیر، کچن کی روٹی پسند نہیں آتی تو بھئی جاؤ نہ خود بناؤ اپنی من پسند کے روغن جوش اور بریانی، اگر کام کرتے ہاتھ تھکتے ہیں تو یہ پڑوس میں ہے کناٹ پلیس۔ بیس ریسٹورنٹ ہیں کھاؤ جا کر مینیو، چڑھنا بھی بیل گاڑی پر اور کہنا یہ بیل ملے۔ ڈلے بھی نہیں۔ شکایت کرنی کہ بیل گاڑی کے پہیے چیختے کیوں ہیں۔

باورچی پہلے سے بھی زیادہ دھماکے سے ان کے سامنے تھالیاں پٹکتے جیسے قیدیوں کی تھالی میں روٹی پٹخی جاتی ہے یا جیسے چڑیا گھر میں پنجروں میں بند جانوروں کے آگے دانہ چارہ یا گوشت کے ٹکڑے پھینکے جاتے ہیں۔

مس پرکاش اور تو سب کو تھوڑا بہت ڈانٹ ڈپٹ لیتی تھی لیکن یہ باورچی اس کے بس سے باہر تھے۔

سرکاری نوکری میں ویسے بھی ڈانٹ ڈپٹ کھاتا ہی کون ہے۔ سرکاری نوکری کا مطلب ہی ہے ساری عمر کی پنشن۔ سرکاری نوکری کرتے ہی وہی ہیں جنھیں کام نہ کرنا ہو۔ جب ساری سرکار ہی کام کے بغیر چل رہی ہے اور چلتی ہی چلی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹی اور بیٹی کے بعد نواسہ تب باقی کے لوگ کام کیوں کریں اب سارے ملک کو چلانے کا ٹھیکہ بیچاری جمعدارنیوں اور باورچیوں (رسوئیوں) نے تو لے نہیں رکھا۔

مسز ملہوترا نے جب ہوسٹل کا چارج لیا تو مس پرکاش نے چاشنی بھرے الفاظ میں کہا ''آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں کام تو پہلے بھی میں ہی سنبھالتی ہوں اب بھی جیسے حکم کریں گی کرتی رہوں گی۔''

مسز ملہوترا مسکرائی اور دل ہی دل میں کہا ''بے وقوف عورت۔ کام کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو کس قابل ہو تم مجھے کیا فکر کرنی ہے میں یہاں فکر و کر کرنے نہیں آئی۔

اس نے کہا ٹھیک ہے مس پرکاش مجھے پتہ ہے آپ بہت باصلاحیت ہو بس جو بھی روز کا بیورا ہو اس کی مجھے رپورٹ دے دیا کرو۔ آخر سارے ہوسٹل کی پوری ذمہ داری تو میری ہی ہے نا۔ کچھ اونچ نیچ ہو جائے جوابدہی تو میری ہی ہو گی نا۔

مس پرکاش نے 'جو بھی ہو روز مجھے رپورٹ دے دیا کرو' کا مطلب سمجھا کہ اس کے کام میں ہوسٹل میں رہنے والی سب ہی عورتوں کی ذاتی زندگی کی معلومات اور چیزیں بھی شامل ہیں۔

سب عورتوں کے ٹیلی فون تو وہ پہلے ہی کان لگا کر سنتی تھی کیونکہ دفتر کا کمرہ بھی چھوٹا سا تھا۔ ایک ہی ٹیلی فون تھا اور اس کی تار بھی چھوٹی سی تھی۔ کون کس کے ساتھ محبت کرتی ہے، کس

کا کس کے ساتھ چکر ہے، کس کا عاشق آج کل خوش ہے اور کس کا ناراض۔ کون رو رہی ہے تو کون ہنس رہی ہے اسے سب خبر ہوتی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ کون سی عورت شادی شدہ ہے اور کون پیدائشی کنواری۔ اکثر سب ہی اپنے نام کے ساتھ مس لکھتی تھیں۔ پر کاش کو پتہ تھا کہ کون اپنے شوہر سے دُکھی ہو کر گھر چھوڑ کر آئی ہے اور کسے اس کے خاوند نے گھر سے نکال دیا ہے۔

سو ان سب کی خبر کھوج رکھنا اس نے اپنا فرض بنا لیا۔ مسز ملہوترا کو بھی اس میں کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ہر بار اسے یہی لگتا کہ ایک نئی کہانی کا پلاٹ مل رہا ہے۔

کہانی لکھی جائے چاہے نہیں، کہانی کے پلاٹ ہمیشہ ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ چھتری پر بیٹھے پالتو کبوتروں کی طرح۔

مسز ملہوترا کی بڑی لڑکی ممتا کسی نکسلائٹ سے محبت کرتی تھی۔ شروع شروع میں جب مسز ملہوترا کو پتہ چلا بہت تلملائی۔ نکسلائٹ سے عشق؟ بھئی عشق وشق کرنا ہی ہے تو کسی کانگریسی سے کر۔ آج نہیں تو کل کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گی۔ یہاں تو ملکہ عالیہ کے بیٹے کی جیپ مرمت کرنے والے موٹر میکنک بھی لیڈر بن گئے اور اس کے ڈرائیور بھی۔

آدمی کو چھلانگ لگانا ہی ہو تو کم سے کم سوکھے کنویں میں تو نہ لگائے۔ لیکن ممتا بھی ماں کی طرح مضبوط اور ضدی تھی۔ جس بات کا ارادہ کر لیتی کر کے ہی چھوڑتی۔ اس پر کسی کے سمجھانے یا لعن طعن یا الزام تراشی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ویسے بھی پڑھائی چھوڑ، وہ آج کل تروینی میں پینٹنگ سیکھ رہی تھی۔ چاہے تروینی میں کوئی بھی پینٹنگ سیکھتا سکھاتا نہیں تھا، بس ایک بڑھیا سا پینٹر تھا پینٹنگ ڈپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر جس کی بیوی بھی کلاکار تھی۔ دونوں کو رہنے کے لیے تروینی میں ہی فلیٹ ملا ہوا تھا۔ سارا دن دونوں اپنی اپنی پینٹنگ کرتے اور بچے پالتے۔ ڈائریکٹر باقی ''اُبھرتے کلاکاروں'' کو تھوڑا بہت گائیڈ کر دیتے کیونکہ ان کی رائے میں اگر ان کے اندر کوئی ہنر ہے تو اپنے آپ کینوس پر اُبھرے گا ہی۔ ٹیکنک وکنک میں کیا رکھا ہے۔ پینٹنگ سکھائی نہیں جا سکتی۔ سکھایا جا سکتا ہے تو صرف رنگوں اور برش کا استعمال۔

مسز ملہوترا نے ممتا کو الٹی میٹم دیا ہوا تھا۔ ''دیکھو اس وقت تم بائیس سال کی ہو۔ ایک سال زیادہ سے زیادہ دو سال میں اور تمھاری ساری خرافات برداشت کر سکتی ہوں، اس کے بعد چاہے پینٹنگ سے کمائی کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو چاہے پڑھائی پوری کر کے نوکری کرو یا پھر اپنے اس کنگلے عاشق سے بیاہ کر کے فٹ پاتھی زندگی کے مزے لوٹو۔ میں ذمہ دار نہیں۔ میں نے پیدا کر دیا پال پوس کر پڑھا دیا، ساری زندگی کا ٹھیکہ تو کوئی ماں باپ بھی نہیں

لے سکتے۔ اب اپنا فیصلہ تم خود کرو۔ کبھی میری صلاح کی ضرورت پڑے تو بتا دینا ویسے تمھیں پتہ ہی ہے میری کیا رائے ہے۔

چھوٹی بیٹی کا نام تھا انسوئیا۔ گھر میں سارے اسے 'انو' کہتے تھے۔

مسز ملہوترا کو اپنی مرضی کرنے والی سرکش بڑی بیٹی سے زیادہ اس شریف کم بولنے والی چپ چاپ سی فرمانبردار بیٹی انو سے زیادہ محبت تھی۔ وہ ابھی اٹھارہ سال کی تھی اور سینئر کیمبرج پاس کرکے کالج میں داخل ہوئی تھی۔

مسز ملہوترا کو اس لڑکی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ سوچتی اس کے لیے اچھے سے اچھا رشتہ ڈھونڈوں گی جو اس کے اسٹیٹس کو بھی تھوڑا اونچا اٹھا دے لیکن ابھی تو کوئی جلدی نہیں۔ لڑکیوں کو بی اے تو کروا ہی دینا چاہیے شادی سے پہلے۔ کہیں کہنا ہی ہو تو اچھا لگتا ہے یہ کہنا کہ لڑکی گریجویٹ ہے۔

ویسے جب مہیش چندرا نے پوچھا تھا ''کتنے بچے ہیں؟'' تب مسز ملہوترا نے صاف صاف بتا دیا تھا ''دو بیٹیاں ہیں'' لیکن جب انھوں نے پوچھا ''کتنی بڑی؟'' تب مسز ملہوترا دل ہی دل میں مسکرائی، تم اپنے کو تیس مار خاں سمجھتے ہو، سوچتے ہو لڑکیوں کی عمر کا پتہ لگا کر میری عمر کا اندازہ لگا لوگے۔ بڑا پرانا ہتھیار ہے جناب۔ بہت گھس چکا ہے۔

مہیش چندرا کو اس نے یہی کہا ''ابھی چھوٹی ہیں اسکول جاتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں لیڈی ارون اسکول سامنے ہی ہے، ہوسٹل سے دو قدم پر وہیں داخل کرادوں گی۔''

مہیش چندرا بھی دل ہی دل میں مسکرائے۔ ''بیوقوف عورت، تمھارے ٹرانسفر کی کوشش کر رہا ہوں تو تمھارے دفتر کی فائل میری ہی میز پر آئی ہوگی اور اس میں سب سے پہلے تمھاری عمر ہی دیکھنی ہوگی۔''

ساہتیہ اکادمی اور ادبی جلسوں میں جانے کے لیے مصنفوں اور نقادوں سے ملنے کے لیے مسز ملہوترا کے پاس اب کافی وقت تھا۔

رہنے کے لیے گھر بھی ملا تو بالکل دہلی کے وسط میں۔ رمیش نگر تو اسے اب دکانداروں اور قلیوں کے رہنے کی جگہ لگتی۔ کوئی پوچھے ''کہاں رہتی ہو؟'' تو بڑی ادا سے کہتی ''کرزن روڈ'' ایک بار تو دوسرا اٹینشن میں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ کرزن روڈ؟ واہ بھئی واہ! کرزن روڈ پر تو دہلی کے رئیس رہتے ہیں۔ یہ بھی کسی توپ خاندان کی ہوگی نہیں؟

اور پڑوس میں ہی پوری دہلی کا کلچرل سینٹر، منڈی ہاؤس، ساہتیہ اکادمی وہاں، سارے ڈرامے وہیں، سارے میوزک پروگرام وہیں، ساری آرٹ اگزبیشن وہیں۔

اب چاہے ڈرامے آرٹ کی سمجھ آئے یا نہ آئے لیکن ہر دانشور کو ذرا ایسی جگہ پر نظر آتے رہنا چاہیے۔ اس لیے مسز ملہوترا سب جگہ پہنچ جاتیں۔ جانے میں کون سی دمڑی لگتی تھی۔ ہوسٹل سے نکلو اور ٹہلتے ہوئے سات منٹ میں منڈی ہاؤس پہنچ جاؤ۔

دفتر کے ٹیلی فون پر ظاہر ہے پہلا حق مسز ملہوترا کا ہی تھا اس کے علاوہ مس پرکاش ان ٹیلی فونوں کو رجسٹر میں نوٹ بھی نہیں کرتی تھیں نہ ہی مسز ملہوترا نے اس کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ ماتحتوں کے سامنے اس طرح چھوٹے نہیں بنتے۔ اتنا تو وہ اپنی طویل ملازمت کے دوران سمجھ ہی گئی تھی۔ کیا ہوا اگر راشن کا دفتر تھا تو۔ ہر دفتر میں افسر اور ملازمین تو ہوتے ہی ہیں اور ان کے باہمی تعلقات بھی۔

مسز ملہوترا نے مس پرکاش سے ٹیلی فون کالوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مس پرکاش نے خود ہی اصول بنا لیا کہ جب مسز ملہوترا کرسی پر ذرا پھیل کر بیٹھ جائیں، سر کرسی سے نکالتے نکالتے رُک جائیں اور اپنی خاص ڈائری یعنی فون نمبر والی ڈائری —— نکال کر سامنے رکھ لیں تو دفتر سے کھسک جانا چاہیے۔

مسز ملہوترا پابندی سے دس بیس مصنفوں، پانچ سات نقادوں، دو تین ایڈیٹروں اور دس پندرہ سہیلیوں کو فون کرتیں۔ کام کے بغیر ہی فون کرتیں۔ کام کے بغیر فون کرو اور بس یہی پوچھو ”کیوں صاحب کیا بن رہا ہے، کیا نیا لکھا جا رہا ہے؟ ہم تو بھائی آپ کی ہر کویتا، کہانی، ناول کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ کب شائع ہو رہی ہے اگلی کتاب؟ اچھا اچھا میں؟ مجھے کیا کرنا ہے خاص۔ بس کبھی کبھی کچھ لکھ ڈالتے ہیں۔ ضرور ضرور بھیجوں گی میں آپ کو تازہ ترین کہانی کی کاپی۔ پھر پوچھوں گی کیسی لگی؟ آپ خود فون کریں گے؟ تب تو کمال ہی ہو جائے گا۔ اچھا اگر سیریسلی (سنجیدگی سے) کہہ رہے ہو کہ فون کرو گے تو میرا نیا فون نمبر اپنی ڈائری میں لکھ لو۔ لکھ لیا؟ بس اب انتظار کروں گی آپ کے فون کا۔ یہ یہاں کا ہے کرزن روڈ کا۔ آج کل میں نے شفٹ کر لیا ہے کرزن روڈ پر۔ لو مبارک کیسی، مبارک تو نئی کتاب کی ہوتی ہے۔ گھروں میں کیا پڑا ہے ایڈریس؟ ایڈریس دوں گی ذرا اطمینان سے۔ ابھی تو گھر سیٹ کر رہی ہوں۔ جس دن ملنا ہو فون کر دینا۔ ترویٹی کے کیفے میں ملتے ہیں، لو اگر آپ کو شری رام سینٹر کا کیفے پسند ہے تو وہیں سہی۔ آپ کی پسند ہماری پسند۔ ہاں ہاں اچھا بائی۔“

بنا کام کے کیے گئے فون کا مزہ ہی اور ہے۔ اس سے پہچان بنتی ہے۔ لوگوں کو اس سے یاد رہتا ہے کہ مسز الکا ملہوترا ہندی ادب کے آسمان میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ نہیں بھی چمک رہا تو کیا ہوا کسی دن تو چمکے گا ہی۔

بڑے معصوم قسم کا 'رابطہ عامہ' جس کا فائدہ کب اور کیسے ہوگا اس کے بارے میں دردسری کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر پبلک ریلیشن کا فائدہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہی ہے۔ اور نقصان کوڑی کا نہیں۔ تھوڑا وقت ہی تو لگتا ہے۔ لیکن سوچو ذرا وقت کا اور اچار ڈالنا ہے۔ وقت کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ فریزر میں رکھ دو اور جب دل چاہے نکال کر استعمال کرلو۔ یہ تو گزرتا ہی جاتا ہے۔ ذرا سمجھداری سے گزارو تو کل کام آئے گا۔

ساہتیہ اکادمی میں اس شام ہندی کے ایک بہت ہی مشہور اور عظیم شاعر کے اعزاز کی تقریب تھی یعنی چائے پانی، ملنا جلنا، گپ شپ پھر اس شاعر کو اپنی نئی تخلیقات سنانی تھیں۔

ہندی ادبی دُنیا میں وہ شاعر نئے انداز کی شاعری کا علمبردار مانا جاتا تھا اور اس کے دو دوست جو کافی مشہور شاعر تھے نئی شاعری کے پیغمبر مانے جاتے تھے۔ ویسے تو ہر ادبی شعبہ میں ہر مصنف فنکار دوسرے کی ٹانگ کھنچائی اپنا دھرم سمجھتا ہے، اگر اپنے کو بڑا کہلوانا ہے تو ضروری ہے کہ باقی سب کو اپنے سے چھوٹا ثابت کرو اور باقاعدہ کرتے رہو، اپنا قد اونچا کرنے کے لیے اوروں کی ٹانگیں تھوڑی کھینچتے جاؤ۔

لیکن یہ تینوں عجیب تھے روز ملتے، گپیں لڑاتے، قہقہے لگاتے، شراب پیتے، روٹی کھاتے اور اپنے علاوہ باقی ساری دُنیا کو بیوقوف سمجھتے۔ ان تینوں نے مل کر ''نئی شاعری'' کی بنیاد رکھی ہے۔ اس بات کو خود بھی مانتے اور لوگوں سے منوانے کے لیے سہ طرفہ منصوبہ بھی بناتے رہتے۔ ایک دوسرے کی تعریف کرو اور کرتے رہو تب نقادوں کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ویسے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں بہت اچھے شاعر تھے، ان کی شہرت ہندی ادب میں ہی نہیں دوسری زبانوں کے ادبی شعبوں میں بھی تھی۔

مگر ازم بھی تب ہی رنگ دِکھاتی ہے جب کوئی صلاحیت ہو، کوئی الگ بات، اندازِ بیاں بھی الگ ہو اور دُنیا کو دیکھنے والی آنکھ بھی۔ باقی الفاظ بیچارے تو وہی ہیں، انھیں ناپ تول کر چھیل تراش کر استعمال کرنے والی سوجھ بوجھ کا نام ہی تو فنکاری ہے۔

خیر ''نئی شاعری'' کے ان تینوں پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کی شام ساہتیہ اکادمی والے منا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسز ملہوترا کا جانا ضروری تھی۔

لیکن ایک گڑبڑ ہوگئی اس دن۔ انو گھر میں بالکل اکیلی تھی، اُداس تھی اور ممتا اپنے نکسل وادی دوست کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی۔ مسز ملہوترا کو انو پر یونہی ترس سا آگیا اور وہ اسے بھی ساتھ لے گئی۔

اس شاعر کی تین شادیاں ہو چکی تھیں۔ پہلی دو بیویوں نے تو شرافت سے طلاق لینا

منظور کر لیا تھا۔ اب شاعر صاحب تیسری سے تنگ آئے بیٹھے تھے لیکن تیسری اڑی ہوئی تھی۔ طلاق کے لیے مان ہی نہیں رہی تھی۔ اس قصہ کا تذکرہ ادبی دُنیا میں بھی تھا۔

شاعر صاحب آجکل بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور بھگوڑے بھی ہو رہے تھے۔ یعنی انڈر گراؤنڈ۔ کبھی بمبئی، کبھی کلکتہ واپس دہلی۔ دہلی آ کر کے اپنے گھر نہ جاتے کیونکہ لڑائی جھگڑے کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ یا تو اپنے دونوں دوستوں کے پاس رہتے یا انڈیا انٹرنیشنل میں۔

جو بھی ہو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے قلم میں کرشمہ جیسا کچھ تھا۔ لکھتے بہت عمدہ تھے تب ہی لوگ ان کی نجی زندگی کو نظر انداز کر کے ان کی کافی عزت کرتے۔ ہندی ادبی دُنیا کے وہ اکبر بادشاہ تھے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ اس وقت ایک نہیں تین تین اکبر ایک ساتھ حکومت کر رہے تھے اور تینوں کے ایک سے تاج تخت، ایک ساتھ چمکا کرتے۔ تینوں کا دربار بھی ایک ہی تھا اور عام طور پر اپنے اکٹھے کیے نورتنوں کو (یا نو سو نو ہزار یا نو لاکھ) بھی مشترکہ جائیداد سمجھتے تھے۔

اس شام ساہتیہ اکادمی تقریب میں مسز ملہوترا نے اپنے پرس سے کتاب نکال کر اس شاعر کو نذر کی۔ کیونکہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئی ادبی لہر کے تخلیق کار کی حیثیت سے (یعنی تینوں میں سے ایک تخلیق کار) وہ کبھی کبھی بڑے عالمانہ تنقیدی مضمون بھی لکھتے تھے، کیا پتہ مسز ملہوترا کی کتاب ''جل بن مچھلی'' کے بارے میں دو لفظ لکھ دیں۔

شاعر صاحب نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ کر کتاب کا تحفہ قبول کیا اور انو کی طرف نظر بھر کر کہنے لگے۔ ''نام تو بہت سنا ہے آپ کا۔ کئی تخلیقات بھی میری نظر سے گزری ہیں لیکن دیدار آج ہی ہوئے ہیں آپ کے۔''

مسز ملہوترا کو ایسا لگا ایکدم ان کا قد اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ ساہتیہ اکادمی بلڈنگ کی چھت کو پھاڑ کر سیدھا آسمان کی طرف اُوپر اُٹھتا جا رہا ہے۔ اسے اپنے سینے کے اندر سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

خوش ہو کر اس نے شاعر سے کہا ''میں ...... میں تو آپ سے ملنے کے لیے برسوں سے تڑپ رہی ہوں۔ ہمیشہ تامل کرتی رہی کہ کہاں مجھ جیسی چھوٹی سی افسانہ نگار اور کہاں آپ جیسی عظیم شخصیت۔ ہمالیہ سے اونچی۔''

کنکھیوں سے وہ چاروں طرف تیز نظر بھی دوڑا رہی تھی کہ کون کس گفتگو کو دیکھ سن رہا ہے۔ کس پر اس کا رعب پڑ رہا ہے اور کون مکا کے دانوں کی طرح بھٹی میں تڑپھڑا کر چٹک رہا

ہے کیونکہ رُعب ماننے والے لوگ ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور بھٹی کی تپتی ریت میں چٹکتے ہوئے سفید کپاہ ہونے والے زیادہ۔

شاعر صاحب نے اپنے موٹے چشمے کے پار سے ایک بار پھر نظر بھر کے انو کو دیکھا اور کہا ''آپ بھی لکھتی ہیں؟''

مسز ملہوترا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''جی نہیں یہ تو میری بیٹی ہے، پڑھتی ہے ویسے اسے ادبی تقریبات کا شوق نہیں لیکن کبھی کبھی چل پڑتی ہے ماں کے ساتھ۔''

''اچھا اچھا۔'' شاعر صاحب نے کہا۔

پھر کتاب کو دیکھ کر بولے۔ ''اسے پڑھ کر میں آپ کو فون کروں گا۔'' مسز ملہوترا نے فوراً اپنا کارڈ نکال کر دیا جس پر فون نمبر اور کرزن روڈ نئی دہلی لکھا تھا۔

''کرزن روڈ؟ یعنی آپ تو بالکل پڑوس میں ہی رہتی ہیں۔''

''جی ہاں بس ساہتیہ اکادمی کے پیچھے ہی سمجھئے۔''

لیکن نہ نمبر نہ کوئی نشانی۔ صرف کرزن روڈ، یہ بھی کیا پتہ ہوا، ایسے پتے تو آدمی تب بتاتا ہے جب اسے کہنا ہو ''دیکھنا کسی دن منہ اُٹھا کر گھر ہی نہ چلے آنا۔'' اور اپنی عادت کے مطابق وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

قہقہے کی آواز سے جو نہیں بھی دیکھ رہا تھا وہ بھی ان کی طرف دیکھنے لگا۔ کئی لوگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ''یہ کون عورت ہے، کس کے ساتھ قہقہے لگائے جا رہے ہیں۔''

لیکن قہقہہ ساہتیہ اکادمی۔ کے سیکریٹری نے بھی سن لیا۔ وہ جلدی جلدی آئے اور شاعر کو اندر اسٹیج پر لے گئے۔

آج پہلی بار انو بھی اپنی ماں سے متاثر ہوئی۔

تیسرے ہی دن شاعر صاحب کا فون آ گیا۔ ''بہت عمدہ کہانیاں ہیں۔ کمال ہے میں جلد ہی ان کے بارے میں لکھوں گا۔''

''اب تو بتاؤ کرزن روڈ کا مطلب یعنی نمبر وبمبر۔ کیا پتہ کب ادھر سے گزرتے ہوئے کب آدھمکوں اور کافی کا پیالہ مانگ لوں۔ ویسے نہ پلانی چاہو تو بیشک نہ بتاؤ۔''

مسز ملہوترا نے نمبر بتا دیا اور اسی شام شاعر صاحب کافی پینے آ پہنچے۔

پھر تو کافی کے لاتعداد پیالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب بھی انھیں آنا ہوتا مسز ملہوترا بن سنور کر بیٹھتی، دل کی گہرائی میں اسے یہ بھی لگنے لگا کہ شاید وہ شاعر اس پر عاشق ہو گیا ہے۔

مبیش چندرا کی تو بات اور ہے۔ آج اس کے پاس کرسی ہے کل نہیں ہوگی۔ ریٹائر ہونے والا ہی ہوگا اور ریٹائر ہو کر سرکاری نواب دو کوڑی کے نہیں رہتے لیکن یہ شاعر اسے تو کبھی ریٹائر ہونا ہی نہیں۔ کتنی عزت ہے اس کی۔ آج کی دنیا میں جینے کے لیے انسان کو اپنا جہاز کسی بھاری بھر کم لنگر کے ساتھ باندھ کر رکھنا ہی چاہیے۔ نہیں؟ وہ سوچتی۔

مسز ملہوترا کو لگتا یہ شاعر اس کا نام پوری دنیا میں روشن کر سکتا ہے۔ کتنی تو جان پہچان ہے اس کی اور تو اور وزیر اعظم تک کے ساتھ چائے وائے پینے جاتا رہتا ہے، صرف ادبی شعبہ میں نہیں اور سو جگہ کام آ سکتا ہے۔

اور اس کے ساتھ یعنی اس عشق سے کسی بدنامی وغیرہ کا بھی خوف نہیں۔ وہ بھی اہل قلم اور میں بھی صاحب قلم۔ ایک سے ادبی لوگ آپس میں ملیں تو حیرت کی کیا بات ہے۔ ہے کہ نہیں۔ وہ سوچتی۔

مس پرکاش نے مسز ملہوترا کو بتایا کہ ہوسٹل کی کچھ عورتیں اعتراض کر رہی ہیں۔ (خواہ اعتراض ابھی سرگوشی کی شکل میں ہی ہے کوئی ٹھوس حقیقت نہیں۔ نہ ہی کسی کی ہمت پڑ سکتی ہے اونچی آواز میں ایسا اعتراض کرنے کی) کہ ہمیں کوئی ملنے آئے تو گیسٹ روم میں ہی ملنے کا آرڈر ہے لیکن مسز ملہوترا کو ملنے والے گیٹ پار کر کے سیدھا اس کے کمرے میں جا گھستے ہیں۔ یہ تو انصاف نہیں۔

کہتی ہیں باقی سب کے لیے تو مہمانوں کا وقت بندھا ہوا ہے۔ ٹھیک آٹھ بجے آ کر چوکیدار سب مہمانوں کو بڑی بیہودگی سے گیسٹ روم سے نکال دیتا ہے لیکن مسز ملہوترا سے ملنے والوں کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہیں، چاہے رات نو بجے آئیں اور آدھی رات کو جائیں۔

مسز ملہوترا کے رخسار غصہ سے دہکنے لگے کیونکہ اس عمر میں وہ سرخ ہونا بھول کر صرف دہکنے لگتے ہیں۔ اس نے تلملا کر مس پرکاش سے کہا ''تم ذرا ان حرامزادیوں کو سمجھا دینا کہ میں اس ہوسٹل میں صرف سر چھپانے کے لیے نہیں بیٹھی ہوئی۔ سرکار نے باقاعدہ یہاں تعینات کیا ہے مجھے اور وہ میرا کمرہ نہیں سرکاری ('بنگلہ' کہتے کہتے رک گئی وہ) کوارٹر ہے۔ سرکار نے مجھے الاٹ کیا ہے ویسے ہی جیسے اور سرکاری افسروں کو باہر کہیں الاٹ ہوتا ہے۔ اس حساب سے وہ میرا گھر ہے اور میرے گھر کون آتا ہے، کون جاتا ہے، کتنے بجے آتا ہے کتنے بجے جاتا ہے اس سے ہوسٹل کے قاعدے قانون کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''بالکل میڈم! وہ تو گھر ہے آپ کا۔ کسی سرکاری کالونی میں ہوتا تو کیا کوئی آپ کے مہمان گننے بیٹھتا؟'' مس پرکاش نے اسے تسلی دی جس میں خوشامد بھی شامل تھی کہ میڈم آپ

فکر نہ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔

مسز ملہوترا کے گالوں کی جنبش میں دھڑکتی لپٹیں کچھ کم ہوئیں۔ ''نہ ہی ان کی طرح میں سپنسٹر (کنواری بوڑھی) اور نہ ہی مجھے کسی نے گھر سے نکالا ہے۔ ان سب کی طرح میں سماج کا کوڑا نہیں ہوں۔ میں عزت دار گھر گرہستی والی عورت ہوں۔ اگر رات کو نو بجے کوئی آتا بھی ہے اور روٹی کھا کر دس گیارہ بجے جاتا ہے تو کیا میں گھر پر اکیلی تو ہوتی نہیں۔ میرے شوہر ہوتے ہیں، میری بیٹیاں ہوتی ہیں، روٹی پکانے والا باورچی برتن مانجھنے والی مائی ہوتی ہے، میں ان سب کی طرح۔'' آگے کچھ سوجھا ہی نہیں کہ کیا کہے۔ ویسے وہ کوئی اس طرح کی بات کہنا چاہتی تھی کہ میں ان سب کی طرح سیکس کی خاطر کسی مرد کے لیے تو تڑپ نہیں رہی۔ میرا اپنا مرد ہے میرے پاس۔ ان کی طرح ترستے ترستے بوڑھی نہیں ہوگئی، لیکن یہ سب اس وقت اس کے دماغ میں اتنا واضح نہیں تھا کیونکہ بات کرتے کرتے اس شاعر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور وہ ذرا بوکھلا گئی تھی۔

مس پرکاش ترچھی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی لیکن ظاہر یہی کر رہی تھی کہ بات ختم ہوگئی اور وہ اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوگئی ہے۔

کچھ دیر بعد مسز ملہوترا نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔ ''اور میں رائٹر ہوں تخلیق کار شخصیت ہے میری۔ ان کی طرح میں گنوار نہیں کہ کام کیا، پیسے لائے، روٹی پکائی، کھائی، کپڑے سلوائے، سوئے جاگے، دو چار کی برائی چغلی کی اور بس دن ٹھپ۔ دوسرے دن گھوم پھر کر پھر وہی۔ سالیاں کولھو کی بیل۔ انھیں کیا پتہ دانشور ہونا کیا ہوتا ہے، اب مجھ جیسی رائٹر سے ملنے ان جیسی کھسر پھسر کرنے والی بیوقوف عورتیں تو آئیں گی نہیں۔ آخر کوئی میرے جیسا دانشور ہی تو آئے گا۔ کوئی ادیب آئے گا، کوئی شاعر کوئی ایڈیٹر آئے گا۔''

آخری بات کا وہ خواب دیکھا کرتی تھی کہ کسی دن ایڈیٹر خود چل کر اس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے۔ ''بہت مدت سے آپ کی کوئی تازہ کہانی نہیں آئی چھپنے، ایسے تو کام نہیں چلے گا نہ اکا جی۔ ہمارے قارئین تو ناک میں دم کیے رکھتے ہیں کہ اکا جی کی نئی کہانی کب چھپ رہی ہے۔ دو نہ کوئی تازہ تخلیق۔''

کھادی گرام اُدیوگ بھون پر سیل لگی ہوئی تھی۔ شام کو مسز ملہوترا اُچھلتی ہوئی جا پہنچی۔ شاید کوئی اعلیٰ قسم کی اور سستی ساڑی مل جائے۔ دیوالی بھی آنے والی تھی، سب کے لیے کچھ نہ کچھ تو خریدنا ہی پڑتا ہے، تو کیوں نہ سیل کا فائدہ اُٹھایا جائے۔

آج کل ویسے بھی اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ زمین سے تھوڑا اوپر اُٹھ کر چلتی۔

اس نے سوچا اس دیوالی میں اپنے شوہر کو بھی ایک سلک کا کرتہ پریزنٹ کرے گی۔ آخر گائے جیسا سیدھا سادہ شوہر تھا۔ پالتو کتے کی طرح پچھلی ٹانگوں میں دُم دبائے بیوی کی ساری منہ زوری برداشت کر لیتا تھا۔

کتا اگر پالتو ہو تو پیٹ تو اس کا بھی ہے کچھ نہ کچھ خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔ ہے کہ نہیں؟ وہ سوچ کر مسکرائی۔

دو تین پیکٹ ہاتھ میں پکڑے وہ کھادی گرام اُدیوگ کے باہر نکلی۔ اب اتنا وزن اُٹھا کر پیدل کون واپس جائے۔ یہ سوچ کر اسکوٹر کے انتظار میں وہ ریلنگ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

تب ہی اس کی نظر دوسری طرف کونے کے جنگلے پر پڑی۔ شاعر اس جنگلے سے ذرا سا ٹیک کر کھڑا تھا پہلے تو اس کا دل چاہا دو قدم آگے بڑھ کر اچانک اسے چونکا دے لیکن پھر اسے لگا نہیں پیکٹ ہاتھ میں لیے اس وقت وہ ایکدم گھریلو عورت لگ رہی ہے۔ اس طرح کسی بھی دانشور کا امیج خراب ہوتا ہے۔ چھوڑو جانے دو۔ اس نے فیصلہ کیا، اسکوٹر ابھی ملا نہیں تھا کہ اچانک دوسری طرف سے اسے انو سڑک پار کرتی نظر آئی۔ ایسا لگا کہ وہ شاعر کی طرف ہی جا رہی ہے۔

انو اس کے پاس آ پہنچی اور شاعر نے بڑی آہستگی سے اس کے کندھے کو اپنی بانہہ کے گھیرے میں لے لیا۔ دونوں کی بھینی مسکراہٹ نے مسز ملہوترا کی رُوح کھینچ لی۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ''گے لارڈ'' کے اندر چلے گئے۔

پہلے تو مسز ملہوترا کا دل چاہا وہ سیدھی گے لارڈ کے اندر جائے اور چوٹی کھینچ کر انو کو باہر گھسیٹ لائے۔

چوراہے پر کھڑا کر شاعر کو جوتے مارے اور کہے ''تمھیں شرم نہیں آتی۔ میرے جتنی عمر ہے تمھاری اور یہ تمھاری بیٹیوں جیسی ہے۔ عشق کے لیے تجھے یہ بچی ہی ملی تھی اور وہ بھی میری بیٹی۔ مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ آخر میں بھی قلمکار ہوں، دانشور ہوں، ادبی دُنیا میں لوگ مجھے بھی جانتے ہیں، میں تو تمھیں پانی پینے لائق نہیں چھوڑوں گی۔ تمام ادبی حلقوں میں تم منہ دِکھانے لائق نہیں رہوگے۔''

پھر اسے گذشتہ چھ سات مہینے میں اس کے سارے چکر یاد آنے لگے جو اس نے اس کے گھر یعنی ہوسٹل میں لگائے تھے۔ اس کے قہقہے، گھنٹوں گھنٹوں بیٹھ کر گپیں ہانکنا اور انو جسے ماں کے کسی بھی جان پہچان والے سے یا دوست کے ساتھ بات کرنا گوارا نہ تھا۔ ہمیشہ چپ چاپ رہنے والی لڑکی کیسے اس کے ساتھ چٹر پٹر باتیں کرتی رہی اتنے مہینے۔

یہ سب کچھ بالکل میری ناک کے نیچے ہوتا رہا اور مجھ بیوقوف کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ کیا ہو رہا ہے۔

میں تو یہی سمجھتی رہی کہ انو سدھر رہی ہے۔ شکر ہے کسی سے بات تو کرنے لگی ہے۔ شکر ہے اسے میرا کوئی دوست ناگوار نہیں گزر رہا۔

اور شاعر کو جب گھر کھانا کھانے آنا ہوتا تب کیسے انو خود لوہے کی کڑھائی میں مرغا بھونتی۔ آہستہ آہستہ دو تین گھنٹے لگا کر جیسے یہی دُنیا کا سب سے ضروری کام ہو۔ لوہے کی کڑھائی میں دھیمی آنچ پر مسالوں اور پسی ہوئی الائچی کی خوشبو میں مرغا بھوننا ہی جیسے اس کی زندگی کا سب سے اہم کام ہو۔

اور میں بیوقوف گنوار عورت یہی سمجھتی رہی کہ شکر ہے لڑکی باورچی خانہ کے کاموں میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے اس کا پیار سمجھتی رہی اپنے لیے جبکہ دراصل وہ سب کچھ تھا اس الو کے پٹھے کے لیے۔

میں تو اسی چکر میں رہی کہ شاعر کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ جاہل بیوقوف، میں اور کوئی نہیں، میں! باقی سب تو دغاباز نکلے شاعر بھی اور میری کوکھ سے پیدا ہونے والی میری اپنی بیٹی بھی۔ میرے ہی خلاف سازش کرتے رہے میرے ہی سامنے اور میں اندھی بنی رہی۔

پتہ نہیں وہ کیسے اسکوٹر لے کر ہوسٹل پہنچی۔ پیکٹ کمرے میں کونے میں پٹک دھم سے پلنگ پر جا گری کٹے پیڑ کی طرح۔

اور پھر شروع ہوا ایک لمبا سلسلہ تناؤ کا، ٹینشن کا، دل کے جلنے بھننے کا، بھلا برا بولنے نہ بولنے کا، جلی کٹی باتوں کے تیر کمانوں کا۔

پیٹا بھی اس نے انو کو روئی کی طرح دُھن کر رکھ دیا۔ لڑکی چپ چاپ مار کھاتی رہی، نہ ماں کو روکا نہ آواز نکالی اور نہ ہی ایک آنسو گرایا۔ بس بے جان کپڑے کی طرح پڑی دھوبی کے ڈنڈے کی چوٹ سہتی رہی۔ بے جان روئی کی طرح جو دھیرے دھیرے دھنی جا رہی تھی۔

جس وقت مسز ملہوترا تھکی ہاری دھم سے صوفے پر گری دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سبک سبک کر رو رہی تھی، تب انو نے بڑی پرسکون متوازن اور سنجیدہ سیانی آواز میں کہا۔ ''رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ساری عمر جو تمھارا دل چاہا تم نے کیا۔ ہم نے ایک لفظ نہیں کہا اب میں اٹھارہ پار کر چکی ہوں، اُنیس کی ہوں۔ آئی ایم اے وومین نو لانگر اے چائلڈ۔ یو کانٹ امپوز یور وِل آن می۔ اِٹ اِز مائی لائف۔ ('مائی' پر بہت زیادہ زور) اینڈ آئی وِل ڈو واٹ آئی لائک۔ اگر تم یہ سوچو کہ تمھاری اس چھت کے نیچے رہ کر تمھارے دیے کپڑے پہن کر تمھاری

روٹی کھا کر میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود نہیں کر سکتی تو ٹھیک ہے آئی وِل واک آؤٹ وِد ہم۔ پپی؟''

انو کی آواز میں نہ غصہ تھا نہ اشتعال نہ ظالم سماج کی کوئی شکایت، نہ اپنے زخموں کی نمائش کہ دیکھو مجھ پر ترس کھاؤ، بس صرف ایک بہت ہی اہم فیصلہ جس کا وزن پختہ اور چٹانوں جیسا ہوتا ہے۔ یہ چٹانیں اگر پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتی آئیں تو سب کچھ تہس نہس کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ راستہ میں جو بھی آئے جو کچھ بھی آئے چور چور ہو جاتا ہے۔

ویسے جس طرح مسز ملہوترا کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور بالکل جھکی گٹھری سی بنی بیٹھی تھی وہ (جیسے عام ہندوستانی عورتیں بیٹھتی ہیں کیونکہ وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر پاتیں اور جو بھی ان کے ساتھ ہو جائے یا ہوتا رہے اس کے بارے میں مسلسل خود پر ترس کھاتی رہتی ہیں۔ جنم بھر، زندگی بھر اپنا فیصلہ خود کرنے کی ہمت سوجھ بوجھ والوں میں ہوتی ہے اور وہ سیدھا تن کر بیٹھتے ہیں جیسے اس وقت بڈّی بڈّی ترّوا کر انو بیٹھی تھی) لگ رہا تھا جیسے انو نے ماں کو مارا ہے۔

مسز ملہوترا نے شاعر کو بھی سمجھایا، گڑگڑائی گرم بھی ہوئی (خواہ مقررہ حد تک، ایک حد تک ہی گرم ہو سکتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کا ادبی کیریئر تباہ بھی کر سکتا ہے اور ہندی ادب کے آسمان پر چمکنے والا ستارہ بنا کر ہمیشہ کے لیے ٹانگ بھی سکتا ہے۔ اب جہاں زندگی کا سوال ہو کیریئر کا سوال ہو وہاں انسان کو کچھ تو محتاط رہنا ہی پڑے گا نا چاہے چوٹ کتنی ہی گہری ہو صدمہ برداشت سے باہر ہو لگام تو کھینچ کر رکھنی ہی پڑتی ہے۔ اُبلتے غصہ پر) لیکن وہ انو کو دیکھ کر پگھلتا رہا مسکراتا رہا۔

''دیکھیے مسز ملہوترا، یہ رشتے کوئی سوچ سمجھ کر تو بنتا نہیں۔ نہ ہی یہ پری پلانڈ ہوتے ہیں۔ اس دن شام جب آپ انو کو لے کر ساہتیہ اکادمی آئی تھیں — ہو گئے شاید ساتھ آٹھ مہینے، نہیں — اس پل شاید اس کے بھی ہزارویں حصے میں میرا اور انو کا رشتہ بن گیا تھا۔''

''لیکن نہ وہ ادیبہ ہے نہ اسے کوئی ادب کا شعور ہے۔ یہ کیسا رشتہ ہے جو ہم خیالی پر مبنی نہ ہو کر ہم بستری پر مبنی ہو؟''

''نو نو مسز ملہوترا۔ دیٹ از ناٹ فیئر۔ ہمیں گٹر کی زبان نہیں بولنا چاہیے، خواہ کتنا ہی غصہ کیوں نہ ہو۔ اتنا نیچے نہیں گر جانا چاہیے۔'' شاعر نے مسز ملہوترا کو ہلکی سی جھڑکی دی۔

''لیکن تم خود ہی بتاؤ تم میری عمر کے ہو یہ ذرا سی لڑکی تمھاری بیٹیوں جیسی ہے۔''

''میری بیٹی کوئی ہے ہی نہیں۔'' اور وہی خاص پیٹنٹ قہقہہ۔ اسی قہقہے سے مخالف 'زمیں بوس' ہو جاتے تھے یعنی بالکل فلیٹ۔ اسی قہقہے سے ادیبوں، دوستوں، عقیدت مندوں، پرستار

مردوں عورتوں کی محفل میں رونق ہوتی تھی ۔ اسی قہقہے سے وہ پبلشروں جیسے دقیانوسی لوگوں سے اپنی کتابوں کی رائلٹی ٹھوک بجا کر وصول کرتے تھے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے ۔

اس قہقہہ میں بڑی کرامات تھیں ۔

بڑا جادوئی کرشماتی قہقہہ تھا وہ ۔

مسز ملہوترا ابھی ڈھیلی پڑ گئی اس کی آواز کا اور بجنل رُعب داب (یعنی جس گھن گرج سے یہ جنگ شروع کی تھی اس نے) بھی ڈھیلا پڑ گیا کہنے لگی ۔ ''لیکن وہ آپ کی تیسری بیوی ؟ وہ تو سنا ہے طلاق دینے کو راضی ہی نہیں ، اس کا کیا ہوگا ؟''

''ایک ہی طریقہ ہے کہ خون کر دوں ۔'' شاعر صاحب کا قہقہہ پھر گونجا '' لیکن وہ میں کر نہیں سکتا ۔ بظاہر لگتا تو نہیں لیکن اصل میں میں کافی ڈرپوک قسم کا آدمی ہوں ۔ دراصل نرم دل شخص بلاوجہ ڈرپوک ہو جاتا ہے ۔ اب نرم دِلی کا گیلا کمبل اُتار بھی پھینکوں تب بھی کیا گارنٹی ہے ، کمبل مجھے چھوڑ ہی دے گا ؟ ویسے مجھے پتہ ہے نہیں چھوڑے گا ۔ نہ ہی چھوڑے اسی میں میرا بھلا ہے ، ورنہ میں شاعری کیسے کروں گا اب آپ ہی بتائیں اگر میں شاعر نہ ہوتا تو میرا کیا ہوتا نہ آپ اس شام ساہتیہ اکادمی آتیں نہ میں انو کو دیکھتا ۔''

''دیکھو پلیز سنجیدہ ہو جاؤ یہ وقت مذاق کا نہیں ۔''

''کمال ہے جب میں بہجد سیریس بات کرتا ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں میں مذاق کر رہا ہوں اور جب مذاق کروں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی آسمانی طاقت مجھ سے بائبل لکھوا رہی ہے ۔ میں بس اس آکاش وانی کو سن سن کر بولتا جا رہا ہوں کیا کروں ؟ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہوتا ہے میرے ساتھ ویسے سنجیدگی سے آپ کسی اچھے نجومی کو جانتی ہیں ؟ سوچتا ہوں ایک بار یہ وہم بھی نکال ہی ڈالوں ۔ زائچہ وغیرہ دکھاؤں اپنا زبردست گڑبڑی ہے کہیں ستاروں وتاروں میں ۔ ۔''

انو دُور بیٹھی جھینپتی ہوئی مسکراتی جا رہی تھی ۔

مسز ملہوترا نے کہا '' میں آپ کی تیسری بیوی کے بارے میں پوچھ رہی تھی ، اگر وہ طلاق نہیں دے گی تو کیا انو کے ساتھ ساری عمر سڑکوں پر گھوم کر بتاؤ گے ؟''

''خیال تو برا نہیں کیوں انو ؟ مکان کا تو کنسیپٹ (تصور) ہی بڑا دقیانوسی ہے ۔ گھر لفظ ہی انسان کو قید کر لیتا ہے ۔ گھر بھی کیا چیز بنائی ہے میرے اور آپ کے بزرگوں نے ۔ یہ نہیں سوچا کہ یہ اتنا خوبصورت آسمان ، یہ عظیم دھرتی ، آوارہ ہوائیں اور خوشبوئیں ، صبح اور شام میں چاند تاروں اور سورج کے کارواں یہ سب کیا خدا نے اپنے کھیلنے کے لیے بنائے تھے ۔ اسی بیوقوف انسان کے لیے ہی تو تھے یہ سارے کے سارے لیکن اس نے کیوں کیا ؟ ان ہی کو نو کہہ

دیا بڑی سی "نہیں" اس حد سے اس حد تک پھیلی ہوئی "نہیں" نارتھ پول سے ساؤتھ پول تک پھیلی "نہیں" مجھے نہیں چاہیے تمھارا نیلا آسمان تمھارے چاند تارے اور سورج وسیع میدان ہرے بھرے کھیت جھومتے درخت گاتے پرندے اُجلی چمچماتی صبحیں، سرمئی شامیں تمھاری ہوائیں اور خوشبوئیں پہاڑ، ندیاں اور نالے گرجتے دریا اور حسین بے پایاں سمندر، بس کہہ دیا اور خود کو چار دیواریوں میں گھیر کر قید کرلیا۔ اتنی وسیع زمین، سمندروں اور ہواؤں کا جو مالک تھا ان کا حصہ تھا قدرت نے جسے اُنھیں کی طرح جینے کے لیے بھیجا تھا سب کا لازمی حصہ ناقابل شکست حصہ بنایا تھا۔ اس کمہار نے ان سب چیزوں کو باہر بنا کر وہ خود اندر سمٹ کر بیٹھ گیا پھر اس نے اوپر جھانکا، اُف یہ نیلا آسمان، بھٹکتے بادل، آوارہ گھومتی یہ جیسی ہوا بند کرو مجھے نہیں چاہیے یہ سب اور اس نے چار دیواری پر چھت ڈال دی۔ اصل میں سچ پوچھو تو جس بزرگ نے بھی پہلی بار کمبخت یہ گھر بنایا وہ سب سے بڑا الو کا پٹھا تھا۔ اصل میں معاف کرنا مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرا کوئی بزرگ تھا (میرا پرخاص زوردار زبردست قہقہہ) کیونکہ میرے اندر تو سمندر اُمنڈ رہا ہے، دھرتی کا پورا وجود ہے میرے اندر، ہواؤں کا شور ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی سفید برف میرے اندر ہے، مجھ میں ایک آسمان بھی ہے جس میں چاند سورج اور ستارے ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ آج کل میری تیسری بیوی کا ستارہ گھومتے گھومتے غائب ہوگیا ہے اور انو کا چمکتا سورج میرے اندر چاروں سمتیں روشن کر رہا ہے اور اس نے ترستی نظروں سے انو کی طرف دیکھا۔

"او ہاں آپ پوچھ رہی تھیں اگر وہ طلاق کے لیے نہیں مانے گی تو انو کو کہاں رکھوں گا۔ سوال آپ کا بڑا جائز ہے۔ میں یونہی بکواس کرنے لگ گیا۔ ہر ماں یہی سوال کرے گی۔ آپ کا حق ہے یہ پوچھنا۔ انو اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ایک ساتھ رہیں گے، مکانوں کی کمی نہیں، دُنیا بھی تنگ نہیں۔ بڑے بڑے شہر ہیں اور ان شہروں میں لاکھوں کروڑوں گھر، کوئی بھی کرایہ پر لے لیں گے اور اکٹھے رہیں گے۔"

انو نے ہاں میں سر ہلایا۔

مسز ملہوترا بوکھلائی۔ "لیکن آپ یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ طلاق کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں آپ؟"

"جب تک اسے اس کا پتہ لگے گا وہ اس کے بارے میں سوچے گی پھر جیسے اکثر ہوتا ہے سارا خاندان جمع ہو کر سوچے گا کوئی وکیل کرکے کچہری جائیں گے، پھر مجھے سمن آئیں گے، میں وکیل کروں گا۔ تاریخیں پڑنی شروع ہوں گی۔ وکیلوں کی آپس میں بحثیں ہوں گی۔ جج اگلی

تاریخیں ڈال دیا کریں گے تب تک ہم اپنی زندگی اپنی مرضی سے اپنے ڈھنگ سے گزاریں گے۔ یہ کیا چھوٹی سی بات ہے مسز اکا ملہوترا؟''

اور دوسرے دن بھی شاعر انو کو ہوسٹل سے لے گیا۔ انو کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ایئر بیگ جیسا تھیلہ تھا جس میں اس کی کنگھی، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور دو چار شلوار قمیصیں تھیں۔

دونوں ہنستے ہنستے چلے گئے۔ جاتے جاتے شاعر نے مسز ملہوترا کے گرد بانہوں کا گھیرا بنایا اور ذرا اپنے سے چپکا لیا۔ بڑی ملائم اور نرم آواز میں کہا۔ ''آئی وِل نیور گو یو اے چانس ٹو رگریٹ دِس مومنٹ۔ آخر ایک پھوہڑ ماں اور ایک تخلیق کار شخصیت والی دانشور ماں میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ یو آر ریئلی گریٹ اکا جی۔''

آج پہلی بار شاعر اس سے اس طرح آدھا سا بغلگیر ہوا تھا اور اس سے کہا تھا وہ نرم پڑ گئی اور ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

وہ چلے گئے تو اس نے باورچی سے گرم گرم چائے لانے کو کہا۔ دو سوریڈون ٹکیاں چائے کے ساتھ نگلیں اور ایک کمپوز بھی کھالی۔

کچھ دیر بعد جب اس کے جھنجھناتے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو اس نے سوچا خوش رہیں۔ بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن تو جانا ہی ہوتا ہے۔ ایک دھیلہ بھی نہیں خرچ کروایا بیچاری نے باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے۔

اچانک اسے لگا کہ غلط سوچ گئی بابل کا گھر مائی فٹ۔ ''امی کا گھر'' کہنا چاہیے ''ماں کا گھر۔'' سونے سے ذرا پہلے جب وہ جاگنے اور سونے کے بیچوں بیچ سنگ مرمری پل پر ٹہل رہی تھی تو ایک خیال سرگشتی کرتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب بچ کر جائے گا کہاں۔ داماد بن گیا اب تو۔ تم تو غیر فانی ادیب ہو گئیں اکا جی۔ وہی بنائے گا تمھیں غیر فانی وہی! ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ممتا بھی اپنے نکسل وادی دوست کے ساتھ رہنے چلی گئی۔

انو کو اس نے فون پر کہا ''تھینک یو انو میں تو کب سے یونہی ڈر رہی تھی خاموشی سے کہ تو نے میرا راستہ بھی صاف کر دیا۔''

مسز ملہوترا کی اکڑ تو کچھ دن ڈھیلی پڑی رہی، آواز میں نہ وہ گونج نہ گرج، نہ حکم میں وہ جوش و خروش نہ ہوسٹل میں رہنے والی عورتوں کو نفرت سے دیکھنے کی ہمت۔

لیکن دھیرے دھیرے جیسے سب ہی طوفان گزر جاتے ہیں یہ طوفان بھی گزر گیا۔ جاندار قہقہے آدھی رات تک گونجنے لگے۔

مسز ملہوترا کا سارا رعب اور دبدبہ واپس لوٹ آیا۔ تقریباً دو مہینے بعد ایک دن بیٹھے بیٹھے

اسے مہیش چندرا کی یاد آئی۔ گورنر ہاؤس فون کیا اور ملاقات کا وقت لیا اور مٹھائی کے دو ڈبے لے کر حاضر ہوئی۔

وہی نخرہ، وہی ادا، وہی بات بات میں شرما کر جھینپ جانا، مٹھائی کے ڈبے پیش کر کے کہنے لگی ''دونوں بچیاں پاس ہو گئیں سر۔ آپ کی بھی تو بیٹیاں ہیں وہ۔ میں نے سوچا منہ تو میٹھا کروا آؤں۔''

''میٹھا منہ تو کسی اور طریقے سے ہو گا مسز ملہوترا۔'' مہیش چندرا کی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے۔ (یہی اچھی بات تھی ان میں کہ حرم کی کوئی بیگم چاہے سال بھر شکل نہ دِکھائے لیکن جب بھی آ جاتی اس کا خیر مقدم کرتے اور پچھلی غیر حاضری کا کوئی طعنہ نہ دیتے۔ اب اس ادا پر کون نہیں مر مٹے گا اے خدا وغیرہ۔)

''جی سر وہ کیسے؟''

''ٹیہہ کا دورہ کرنے جا رہا ہوں۔ بس یونہی بہانہ ہی بنایا ہے۔ دہلی کی گرمی سے باہر نکلنے کا۔ ساتھ چلو تو منہ بھی میٹھا ہو جائے۔''

''ضرور سر۔'' نرم ملائم آواز نظریں اسی طرح نیچی اور شرماتی ہوئی کرسی پر تھوڑی اور سمٹ آئی، وہ شرماتی ہوئی گٹھری سی بن گئی۔

OO

شہر یا گھونگا

جس وقت میں نے ایک عرصہ سے بچھڑی اُس دھرتی پہ قدم رکھا، دو پہر ڈھل رہی تھی۔ سنہری دھوپ اور رُک رُک کرآہستہ آہستہ بہتی ہوئی ہوا۔

میں نے آسمان کی سمت دیکھا وہ اسی طرح تھا جس طرح سہ پہر کا کوئی بھی آسمان ہوتا ہے۔ تھوڑا سا گرد و غبار میں لپٹا ہوا لیکن نیلا اور ہلکا سرمئی سا۔

میں نے زمین کی طرف دیکھا۔ اُس محبوب مٹی کی طرف جس نے نصف صدی قبل مجھے گڑھا تھا۔ وہ بھی ویسی ہی تھی جیسے کوئی بھی مٹی اگست کی سہ پہر کے وقت ہوتی ہے پیاسی سی، بدحواس سی، گرد آلود۔ بے سہارا۔

یہ وہ شہر تھا جہاں میں نے دنیا میں آ کر پہلی سانس لی تھی۔ یہ وہی شہر تھا جو اتنے برسوں سے میری یادوں میں مصری کی طرح گھلا ہوا تھا یہ وہی شہر تھا جو ایک تیرِ نیم کش کی طرح برسوں سے میرے سینے میں ترازو تھا۔ یہ وہی شہر تھا جس میں کبھی میرے بچپن کی سہیلیاں روشنی اور پرکاش اور کشور رہا کرتی تھیں۔ اور سینتالیس کی آندھی میں کھو گئی تھیں۔

لاہور!

لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میری روح لرز گئی۔

عرصہ بعد اپنے وطن کی سرزمین سے ملنے کی لرزش تھی؟ یہ اُن تمام خونی دریاؤں اور آگ کی لپٹوں کو پھر سے آس پاس محسوس کرنے کی دہشت کی کپکپی تھی۔

ماضی کی راکھ میں سے کتنے بھولے بسرے چہرے اور واقعات میرے اِرد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھے تھے۔

جس سرزمین پر تم نے پہلی بار سورج کی پہلی کرن کا اُجالا دیکھا ہو جس سرزمین نے پہلی بار تمھارا توتلا کر بولنا سنا ہو۔ جس زمین پر تم نے پہلی بار ماں کے دودھ کا نیم گرم اور شہد جیسا آبِ حیات ہونٹوں سے چھوا ہو زبان سے چکھا ہو وہ زمین ہمیشہ تمھارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

چاہے تم کہیں بھی چلے جاؤ۔ چاہے سات سمندر کے پار بھی چلے جاؤ۔ وہ سرزمین تمھارے دل کے نہاں خانوں میں رہ کر سفر طے کرتی رہتی ہے۔

ایئرپورٹ، کسٹم والے، میرے سوٹ کیس کی تلاشی لینے میں مصروف تھے۔ میں ان سے کہنا چاہتی تھی۔ بیوقوفوں یہ تو میرا شہر ہے۔ اتنے برسوں بعد...... اور تم۔

ایئرپورٹ سے باہر نکلی تو کچھ دوست مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ مسکراہٹوں کے تحفے لے کر، ہمسائیگی اور دوستی کی نرم دھوپ لے کر۔

ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے میں سڑکوں اور عمارتوں کو حسرت سے دیکھتی جارہی تھی۔ وہی محبوب سڑکیں جو اتنے برسوں سے میرے خوابوں میں زندہ تھیں۔ کیا کہنے لاہور کی سڑکوں کے۔ چاہے میں دنیا کے کسی بھی شہر میں چلی جاؤں وہاں کی سڑکیں مجھے لاہور کی سڑکوں کی طرح صاف اور ملائم نہیں لگ سکتیں۔ لاہور کی سڑکیں جیسے سرمئی ریشم کے تھان کھل کر پھیلے ہوں۔

لیکن آج ان سڑکوں کو کیا ہوگیا تھا؟ دھول سے اٹی ردی کاغذوں کے ٹکڑے اور خشک آوارہ پتے بدحواس ان کے بدن پر اڑ رہے تھے۔ اڑ ہی نہیں رہے تھے، محض لڑھک رہے تھے۔

میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ سینے کی گہرائیوں سے ایک عجیب سی ہوک اُٹھ کر حلق میں خراش ڈالنے لگی۔ نہیں نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا میں جا کر ذرا غسل کرلوں۔ کپڑے تبدیل کرلوں بال سنوارلوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سڑکوں پر دھول تو ہوتی ہی ہے۔ موسم ہی ایسا ہے۔ پتّے درختوں سے گر کر سڑک پر چہل قدمی نہیں کریں گے تو کیا چڑیوں کی طرح آسمان کی طرف پرواز کریں گے۔ بیوقوف عورت۔ میں اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی۔

ہوٹل پہنچے تو محسوس ہوا کہ یہ کسی بھی شہر کا کوئی بھی ہوٹل ہوسکتا تھا۔ تیز چکا چوندھ روشنی میں جھلنے کی کوشش میں مصروف، ریسیپشن ڈیکس، بیل بوٹے، لفٹ، صاف ستھرا کمرہ، ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل، موٹے قالین، دبیز پردے۔ خوبصورت بیڈ کور۔ ہر ہوٹل میں یہی تو ہوتا ہے۔ اگر میرا کوئی ہوٹل ہو، تو میں اس موسم میں فرش ننگا رکھوں تاکہ پیروں کے تلوؤں کو ذرا ٹھنڈک ملے۔ بیڈ کور اور چادریں سب ہی سفید ململ کی بچھاؤں جیسے نرم ململ کے دوپٹے میری ماں، میری نانی اور میری دادی اوڑھا کرتی تھیں۔

لیکن ہوٹل ہی کیوں۔ میرا تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔

اپنے بچپن کے گھر کے گلے لگ کر پیار کرنے اور رونے ہی تو آتی تھی میں۔

ویسے وہ گھر کہیں نہیں گیا تھا۔ جس جس نئے شہر میں جا کر ہم اُجڑے ہوؤں نے دوبارہ بسنے کی کوشش کی تھی وہ گھر ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا۔ پہلے شملہ، پھر جالندھر اور پھر آخر کار دلّی۔

دلّی ہی کیوں۔ دنیا کے جس کسی شہر میں میں گئی تھی۔ اسی لاہور والے گھر کو اپنے کلیجے میں اُٹھائے پھرتی رہی تھی۔ لاہور والا گھر، لاہور کی سڑکیں، لاہور کے آسمان۔

سانجھ ڈھلے سرمئی آسمان کے کینواس پر سیاہ لکیریں بناتی کووں کی قطاریں۔ گھروں کو لوٹتے پرندے۔ ایک ہی طرف، ہمیشہ ایک ہی طرف اڑتے ہوئے۔ ہمارے گھر کے اُوپر سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُڑان بھرتے ان کے سیاہ ڈینے۔ کبھی کبھی غروب ہوتے ہوتے سورج کی کوئی سنہری کرن ان کے سیاہ، پروں پر اُلجھتی۔

اور تمام دن ہوا میں آوارہ گردی کرنے والی چیلیں دھیرے دھیرے اُڑتیں ہمیشہ گردن کو نیچے جھکائے، زمین پر نظریں گاڑے، جھپٹا مارنے کے لیے بے تاب لیکن کبھی کبھی وہ بھی نیلے آسمان کی پنہائیوں میں بے نیاز ہو کر اُڑنے لگتیں کبھی پنکھوں کو تولتیں۔ کبھی اوپر نیچے ہوتیں۔ مگن۔ تب مجھے احساس ہوتا کہ بادل اُمڈ کر آئیں گے اور بارش ہوگی۔ چیلوں کی مست اُڑان سے آنے والے بادلوں کی اور بارش کی پیشین گوئی ہمیشہ سچی ثابت ہوتی ہے۔

''بی جی، چھت سے ڈھینگری کے ہار اُتار لاؤں؟'' چارپائیاں برآمدے کی اوٹ میں کھڑی کروں؟ بارش آنے والی ہے۔''

''پگلی۔ بارش کہاں؟ وہ آسمان کی طرف دیکھتیں' بادلوں کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں اور اسے برسات نظر آ رہی ہے۔ تمام دن چھت پر پتہ نہیں کیا کرتی رہتی ہے۔ اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی ہے۔''

کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ آرام سے لیٹے لیٹے آسمان کے سمندر میں چیلوں کا ڈوبنا۔ اُترنا اور بغیر بازو ہلائے ہوا میں تیرنے کا کھیل دیکھتی رہوں۔ ڈھینگریاں۔ مرچیں۔ میتھی اور چارپائیاں بارش سے بھیگتی ہیں تو بھیگتی رہیں۔ مجھے کیا۔

لیکن میں چپ چاپ اس تمام بکھیڑے کو سمیٹ جاتی۔ زینے پر سب کچھ چھپا کر رکھے جاتی۔ اپنی ڈھیلی ادوائن والی اور گھس گھس کر نرم ہوئے بانوں والی چارپائی کو چھوڑ کر باقی سب ہی چارپائیاں اوٹ میں کھڑی کر دیتی۔ ہمیشہ ادوائن والا حصّہ اوپر کی طرف اور پائے نیچے کی طرف کر کے چارپائی کھڑی کرتی۔ بی جی کہا کرتی تھیں کہ ادوان والا حصّہ اوپر کی طرف کر کے

چارپائی کھڑی کرنا بدتمیزی ہے۔

بدتمیزی ایک خاص لفظ تھا۔ جسے نہ کرنے والے کاموں کے لیے بی جی بولا کرتی تھیں۔ بھائی کے ساتھ نہیں لڑتے بدتمیزی ہوتی ہے چک کھول کر باہر چھجے پہ کھڑے نہیں ہوتے بدتمیزی ہے۔ کسی مہمان کے سامنے آ کر نہیں بیٹھتے بدتمیزی ہوتی ہے۔ دھڑ دھڑ کرتے سیڑھیوں پر چڑھنا اُترنا بدتمیزی ہوتی ہے۔ زور سے نہیں ہنستے بدتمیزی ہوتی ہے۔ اونچا نہیں بولتے بدتمیزی ہوتی ہے۔ کاکا باہر کھیلنے جائے چاہے سو بار جائے لیکن لڑکیاں باہر کھیلنے نہیں جاتیں بدتمیزی ہوتی ہے۔ آئینہ کے سامنے بے کار کھڑے کھڑے اپنا چہرہ زیادہ نہیں دیکھتے۔ بدتمیزی ہوتی ہے۔ بڑوں کے سامنے نہیں بولتے بدتمیزی ہوتی ہے۔ لڑکیاں گھر کا کام کرتی ہیں نہیں تو بدتمیزی ہوتی ہے۔ کسی پرائے مرد سے باتیں نہیں کرتے بدتمیزی ہوتی ہے۔

تقریباً سب ہی باتیں بدتمیزی کے زمرے میں آتی تھیں۔ صرف بھوندو بنے ان کے ہر حکم کی تعمیل کیے جانا صرف اسکول کی کتابیں ہی پڑھنا۔

باورچی خانہ میں جا کر ان کی مدد کرنا اور کھانا بنانا سیکھنا۔ بس یہ دو چار باتیں رہ گئی تھیں جو بدتمیزی میں شمار نہیں ہوتی تھیں۔

یہ سب باتیں پتہ نہیں کیوں مجھے اتنے برسوں بعد یاد آ رہی تھیں۔ شاید یہ اس شہر کی تاثیر تھی جس میں سانس لینے کے لیے میں اتنے برسوں بعد آئی تھی۔ میرے بچپن کا شہر جو برسوں پہلے بچھڑ گیا تھا اور جو سالوں سال میرے ساتھ چلتا رہا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اسے سنا جا سکتا تھا کیونکہ وہ میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ بج رہا تھا۔ برسوں سے ڈھیلی پڑی ڈھولک کی ڈوریاں کسی نے کس دی تھیں اور اب ڈھولک کے چمڑے پر سارا گزرا وقت اپنی انگلیوں سے تھاپ دے رہا تھا۔ دھم، دھم، دھم، دھم، دھمک دھم۔

زندگی میں ہر درد، ہر آواز، ہر لمحہ موجود رہتا ہے۔ زندہ رہتا ہے تنہائی کے لمحات میں انھیں سنا جا سکتا ہے۔

رات ہوگئی۔ دوست جو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے آئے تھے، گھر جا چکے تھے۔ اب میں تھی اور میرا شہر تھا۔ میں چپ چاپ ہوٹل سے نکلی۔ اور سڑک پر چلنے لگی۔ لاہور۔ یہ شہر بیالیس برس میرے خون کے ہر قطرے کے ساتھ میری نسوں میں بہتا رہا تھا۔

میری ماں آہ بھر کر کہتی۔ ''چھوڑے گاؤں کا کیا لینا نام۔ میری نانی کہتی تھیں۔'' جب جڑیں ہی کاٹ دی گئیں تو کیا یاد کرنا اس مٹی کو۔'' لیکن میں کہتی تھی۔ ''کیوں'' نام کیوں نہیں لینا

اس شہد جیسے شہر کا وہ میرا وطن ہے۔ میرا شہر۔ میں ایک بار ضرور واپس جاؤں گی۔ جا کر تلاش کروں گی اپنی جڑوں کو۔ جڑوں کے گرد لپٹی مٹی کو۔ اس محبوب زمین کے بوسے لوں گی۔ اپنے بچپن کو تلاش کروں گی جو بال بکھرائے اب بھی وہیں کہیں گاؤں میں کھیل رہا ہوگا۔ جن گلیوں میں کھیلنے کے لیے میں ترستی رہتی تھی۔ کیونکہ اب بی جی نہیں رہی تھیں جو کہتیں۔ لڑکیوں کے لیے گلی میں کھیلنا۔ بدتمیزی ہے۔

ہم چاہے کہیں بھی پرائے دیس میں جابسیں پرائے شہروں میں، ہمارا وجود درخت کی طرح بڑھ کر چاہے کن ہی ہواؤں اور سمتوں میں پھیل جائے۔ جب بھی ہم اپنے پیر ڈھونڈنے لگتے ہیں تو وہ جڑوں کی طرح اسی زمین میں پھیلے ہوتے ہیں جس زمین نے ہمیں جنم دیا تھا۔

وہ لوگ کتنے بڑے اور بھیانک عذاب کو برداشت کرتے ہیں جن کے پیر کسی اور جگہ زمین میں گڑے ہوتے ہیں اور شاخیں کسی دوسری فضاؤں میں پھیلتی ہیں۔

سڑک خالی تھی۔ تقریباً خالی۔ صرف کبھی کبھی کوئی موٹر زوں کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن وقت کے چھوٹے چھوٹے ڈھولوں پر بجتے ڈنڈوں کی طرح مسلسل دھک دھک کر رہی تھی۔ لگاتار صاف اور واضح آسمان تک پہنچ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی طرح پھدکتی ہوئی آسمان کی طرف اُڑان بھر رہی تھی۔ ان سورجوں کی طرف جو ہمارے سورج سے بہت دور ہیں۔ لیکن آسمان میں تارے جگمگا رہے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا۔ تارے پھٹ کر سورج بن رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں سورج۔

مجھے چکر سا آیا۔ شاید بہت تھک گئی تھی۔ سفر سے جذبوں کی شدت سے خوابوں کے بوجھ سے۔ میں واپس ہوٹل آ گئی۔

اگلا دن اس کانفرنس میں گزر گیا۔ جس میں مقالہ پڑھنے کے لیے مجھے لاہور والوں نے بلایا تھا۔ کئی نئے دوستوں سے۔ کارڈ۔ پتے۔ فون نمبر لیے دیے جا رہے تھے۔

لیکن میری کشور کہاں تھی؟

رونی اور پرکاش تو آندھی میں اڑتے تنکوں کی طرح کھو چکی تھیں وہ تو اس شہر میں ہو نہیں سکتیں۔ اُن سے بھی بچپن کا یہ شہر بچھڑ گیا تھا۔ لیکن کشور...... کشور تو۔ یہیں کہیں ہوگی۔

کہاں۔ کہاں۔؟

میں لوگوں سے ہنس ہنس کر ملتی رہی۔ لوگوں کے لیکچر سنتی رہی۔ میرا مقالہ بھی لوگوں نے

سن لیا۔ روٹی کھائی گئی۔ چائے لی گئی۔ یعنی کے جو کچھ بھی ضروری طور پر ہونا چاہیے تھا، ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میرے دل میں عجیب سی اُمس اور اُداسی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس ایک عجیب سی اُتھل پتھل جیسے سمندر کا گمبھیر سا شور۔ پھڑ پھڑاتی ہوئی ایک بے چینی۔

ایک پوری شام۔ پوری رات اور پورا دن بیت گیا تھا۔ اور میں ابھی تک اپنے گھر نہیں گئی تھی۔

عجیب بات ہے نا۔ کبھی کبھی بہت بے چینی سے ہم جس ملاقات کا انتظار کرتے ہیں اسی سے ذرا ذرا سہمتے بھی رہتے ہیں۔ ایک انجان سا خوف ریشہ ریشہ ہو کر دل کے کسی گوشے میں چھپا رہتا ہے۔ سہمے ہوئے خرگوش کی طرح۔ یہ خوف شاید خوابوں کے لہولہان ہونے کا ہوتا ہے۔ جس خواب کو ہم چوزے کی طرح سال در سال اپنے سینے کے اندر چھپائے پھرتے ہیں اس کے ذبح ہو جانے کا خوف۔

دل کے کسی نہاں گوشہ میں یہ احساس بیدار رہتا ہے کہ پلوں کے نیچے سے گزرتا پانی کبھی بھی وہ پانی نہیں ہو سکتا جو بیالیس برس پہلے پلوں کے نیچے سے گزرا کرتا تھا۔

زندگی اور موت ایک ہی وقت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

تم لہر کو پکڑ سکتے ہو؟

ابھی ہے اور ابھی نہیں۔ یہ گئی وہ گئی۔ ایک روشن پل کی طرف آتی ہوئی لہر چمکتی جھلملاتی اور اس لمحہ سے دور جاتی ہوئی لہر، اُداس، غمگین، مٹمیلی، روشنی کی چکا چوندھ اور چمک خالی۔ بے جان۔

کیا ہم روشن لمحات کو پکڑ سکتے ہیں۔ جو ابھی ہیں اور ابھی نہیں۔

انسان کے ساتھ قدرت کا سب سے بڑا دھوکا یہ نہیں کہ ایک دن موت آئے گی اور ان تمام خوابوں، اُمیدوں، خواہشات اور خدشات کو کوڑے کی طرح سمیٹ کر بہا کر لے جائے گی۔ اس کے جسم کو اس کی روح کو بھی۔ جسے وہ اپنا وجود سمجھ رہا تھا اور اس کو سنوارنے میں، سجانے میں، آرام دینے میں اتنی محنت کرتا تھا۔ محنت اور وقت۔ وقت جو انگلیوں سے ریت کی طرح گرتا جاتا ہے۔ نہیں ان تمام دھوکوں سے بڑا فریب ہے وہ انتظار، جو کائنات کے خالق نے انسان کی زندگی اور موت کے درمیان ایک تنی ہوئی رسّی کی طرح باندھ دیا ہے۔ جس پر وہ تمام عمر ایک بازیگر کی طرح اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش میں گزار دیتا ہے۔

انتظار اور خوابوں کے چکنا چور ہو جانے کی خوف۔

یہ قدرت کا ایک فریب ہے۔ انسان کے ساتھ کیا گیا مذاق۔ مثلاً تمھیں یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ ساری کائنات صرف تمھارے سینے میں دھڑکتی ہوئی ایک دھڑکن ہے۔ کافی مدت کے بعد احساس ہوتا ہے۔ احساس بھی نہیں پتہ لگتا ہے کہ تمھارا اپنا وجود تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو محض ایک خشک پتہ ہے جسے دنیا میں ہونے والی کوئی بھی سازش، کسی بھی قائد کا کوئی غلط فیصلہ دنیا کو چلانے والی کسی انسانی یا شیطانی طاقت کا دماغی فتور آندھی سے لڑھکتا ہوا کہیں سے کہیں لے جا سکتا ہے۔

تب بھی یہ ہی ہوا تھا۔ سن سینتالیس میں رہنماؤں کو اقتدار چاہیے تھا۔ طاقت چاہیے تھی۔ حکومت چاہیے تھی اور ہو گیا لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ۔ تب لہو کا چھٹا دریا بہا تھا پانچ دریاؤں کی سرزمین پر۔ لاکھوں لاشوں کی سڑاندھ اور لاکھوں لوگ گھر سے بے گھر ہو کر در در بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ جڑ سے کٹے درخت یہ تو ان کا ہی دم خم تھا کہ جڑوں کو کسی اور مٹی میں چھوڑ کر وہ پرائی ہواؤں اور فضاؤں میں برگ و بار لانے لگے تھے۔

عجیب چیز ہے نا یہ انسان بھی، جڑیں کسی اور دھرتی میں اور شاخیں کسی دوسری زمین کے آسمان تلے۔ کانفرنس کے بعد ہونے والے مشاعرے میں میں یہی سب سوچتی رہی۔

واپس ہوٹل میں چھوڑنے آئے میزبان سے میں نے پوچھا۔ ''لارنس گارڈن کہاں ہے؟ وہ ہنسا ''یہی تو ہے لارنس گارڈن۔''

''لارنس گارڈن والی سڑک پر ہی تو ہے آپ کا یہ ہوٹل۔''

واقعی؟ تو رات میں لارنس گارڈن کے ایک دم نزدیک سڑک پر ہی گھومتی رہی تھی؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس سڑک پر تو جگنو ٹم ٹم کرتے رہتے تھے چھوٹی چھوٹی سی لالٹینیں اپنے پیٹ میں چھپائے جھاڑیوں میں، گھاس میں، اڑتے پھرتے تھے۔ انھیں پکڑ کر دوپٹہ کے پلو میں جمع کر لیا کرتی تھی۔ ایسا لگتا جیسا تاروں کا ایک لیمپ میرے پلو میں ٹمٹا رہا ہو۔

پھر انھیں وہیں جھاڑیوں میں آزاد چھوڑ دینے میں کتنا سکون ملتا تھا۔

وہ سب جگنو کہاں چلے گئے میرے؟ تاروں کی طرح ٹم ٹم کرتے جگنو تلاش کروں گی۔ آج شب تلاش کروں گی انھیں میں نے فیصلہ کیا۔

رات میں پھر اس سڑک پر چل پڑی۔ لارنس گارڈن کے اندر کی طرف جو چھوٹی سڑک جاتی تھی اس پر چلنے لگی۔ اندھیرے میں آس پاس موجود درخت بہت اُداس لگ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ بہتی ہوا میں اُداسی سے سر ہلاتے ہوئے پتوں پر ہوا ٹہل رہی تھی۔ اور اوپر آسمان میں آدھا چاند اپنی کمی پر اُداس تھا۔ جیسے کٹے ہوئے کاغذ کا بنا ہوا ہو۔ کٹی پتنگ کی طرح درختوں کی اونچی شاخوں میں پھٹا ہوا لگ رہا تھا۔

بچپن میں پتنگوں کے موسم میں جب بھی کوئی پتنگ کہیں کسی درخت کی اوپر والی شاخوں میں اٹک جاتی تھی۔ بچے لمبے بانس لے لے کر اس کو اُتارنے کی کوشش کرتے۔ بانسوں کے سرے پر کٹیلی جھاڑاں بندھی ہوتیں۔ تمام عقلمندی اور کاری گری اس بات میں ہوتی کہ پتنگ صحیح سلامت۔ ثابت، پھٹے بغیر اس بانس میں اُلجھ کر نیچے آجائے۔

کس بانس سے یہ چاند کی پتنگ پیڑوں کی ٹہنیوں سے اُتاری جا سکتی تھی؟ لارنس گارڈن میں اندھیرے میں لپٹے۔ آہستہ آہستہ کانپتے درخت تھے۔ جھاڑیاں تھیں۔ شاید پھول بھی ہوں گے لیکن نظر نہیں آرہے تھے۔ مگر جگنو نہیں تھے۔ سب ہی جگنو کہیں چلے گئے؟ میرے دل کو گہری اُداسی نے اپنے حصار میں لے لیا۔ میں واپس ہوٹل کی طرف چل دی۔ اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اوپر دیکھا۔ اب چاند کسی عمارت کی منڈیر پر سر ٹکا کر اونگھ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا کانپ رہا تھا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ ایئر کنڈیشن کمرا کافی سرد تھا۔ میں نے کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اور آنے والے دن کے انتظار میں سو گئی۔

تمام شب عجیب وغریب خواب آتے رہے اور میں چونک چونک کر جاگتی رہی پانی پی پی کر سارا جگ خالی کر دیا۔ صبح ایسا محسوس ہوا جیسے میں رات بھر بھُربھری ریت پر چلتی رہی تھی۔ صاف ستھرے راستہ پر چلنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن ریت میں چلنا۔ جب ایک پیر کی ریت اپنے پیٹ میں گھسیٹ کر جذب کر لینا چاہتی ہو۔ اُسے تم کھینچ کر نکالتے ہو۔ پھر دوسرے پیر کو وہ اپنی نرم مگر مضبوط گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ اپنے ...... نرم تھل تھل ہاتھوں میں۔

ریت میں چلنے سے آدمی اتنا ہی تھکتا ہے جتنا کہ کسی پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے میں۔

دوسرے دن میں نے دوستوں سے کہا۔ ''مجھے چیمبر لین روڈ لے چلو۔'' آپ کے گھر؟ ''میرا کا ہے کو۔ اب تو گھر ان کا ہے جو وہاں رہتے ہیں۔ لیکن میں ذرا۔'' میں ہچکچا رہی تھی۔

میں چیمبر لین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ میرے گلے میں کچھ پھنسا ہوا تھا۔ جیسے دھک دھک کرتا ہوا میرا ہی دل ہو جو گیند کی طرح گلے میں آخر پھنس گیا تھا۔

میرا۔ گھر ...... گھر ...... گھر۔

ذہن میں اک تارہ بج رہا تھا۔ گھر...... گھر...... میرا گھر۔

موٹر بدحواس سی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا، ہم کسی اور طرف آ گئے ہیں۔ ویسے لاہور کی بہت سی سڑکوں کی تو مجھے پہچان ہی نہیں تھی۔ بس اپنی سڑک یاد تھی چیمبر لین روڈ۔ دوسری طرف گوال منڈی کے گرودوارہ کو جانے والی گلی۔ موڑ کے بعد اور گلی پھر اور گلی پھر سڑک پھر گرودوارہ۔ وہ گلیاں ابھی بھی میرے ذہن میں پیر پسارے بیٹھی ہوئی تھیں۔

اور یاد تھی نسبت روڈ جس سے گزر کر آتی تھی ایبٹ روڈ جس کے اختتام پر میرا اسکول ہوا کرتا تھا۔ درمیان میں ملکہ کا مجسمہ اور دیال سنگھ کالج اور یاد تھا لارنس گارڈن۔ مخملی گھاس، اور پھولوں کی کیاریاں، اور درخت رشیوں کی طرح سمادھی میں مگن اور تپسیا کرتے درخت۔ باہوں کو آسمان کی طرف پھیلائے عبادت میں کھڑے درخت۔

اور بوٹینکل گارڈن، جس میں پستوں کو تراش خراش کر بنائے گئے تھے اونٹ، گھوڑے بیل اور اور مور اور تمام جانور اور پرندے تھے۔

اور چڑیا گھر۔ زیبرے۔ رود بلاؤ اور پہاڑی طوطے۔

اور سکر یڈ ہارٹ اسکول جس میں مجھے پہلے داخل کروایا گیا تھا۔ بھارت بلڈنگ میں سے گزر کر کے بیچ میں سے گزر کر، پچھلی طرف۔ یوکلپٹس کے سفید درختوں سے گھرے کچے راستے سے چلتی ہوئی میں اسکول جایا کرتی تھی۔ یوکلپٹس کے لمبے لمبے درخت، سفید تنوں والے اور سبز کچے پتیوں والے جن کے نیچے کھڑے ہو کر خوشبوؤں میں نہالیا جاتا۔

اور انارکلی۔ ڈبی بازار۔ ڈیرا صاحب گرودوارہ میری نانی کا بیر ملکی کی گلی والا گھر۔ جہاں میں نے دنیا کی چکا چوندھ روشنی میں پہلی بار آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں میری نانی جی چولھے کے پاس بیٹھی کچھ نہ کچھ پکا رہی ہوتیں۔ یا کپڑے سیتی رہتیں۔ جہاں آنگن میں ان کے سب خاندان کے لیے یعنی میرے ماما۔ میرے موسیاں اور میری ماں کے خاندان کے لیے ہر سردی کے موسم میں رضائیاں بنتی تھیں۔ پرانی رضائیوں کو کھول کر اس میں سے لوگڑ نکال کر پنجارے سے دھنوایا جاتا۔ نئی روئی کو دھنتے وقت اس میں سے کپاس کے بیج اُڑ اُڑ کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے۔ اور پھر رضائیوں کے غلاف بنتے۔ درمیان میں کپڑا کسی اور رنگ کا کنارے پر دوسرے رنگ کی جھالر یا گوٹ لگائی جاتی۔ میری نانی جب رنگ برنگے ریشموں کو پاس پاس رکھ کر دیکھتیں کہ کون سا رنگ کس رنگ کے ساتھ کھلے گا۔ تب وہ دھیان میں گم سم کسی فنکار کی طرح لگتی تھیں۔

میری نانی کے گھر ان کے چولھے میں سے ہمیشہ شعلے اُٹھتے رہتے اور لکڑی کی چنگاریاں، چٹختی ہوئی۔ جگنوؤں کی طرح چولھے کے آس پاس اُڑتی رہتیں اور چولھے پر پکوان پکا کرتے۔ ایک کوئلے کی انگیٹھی اور ایک مٹی کا چولھا تین اُٹھے ہوئے کونوں والا جیسے مٹی کے قلعہ کے تین برج ہوں اور سامنے کی طرف قلعہ کا کھلا دروازہ۔ روٹی پکاتے وقت نانی لکڑیاں زور زور سے جھاڑ کر چولھے کے اس دروازہ کے پاس ہی دروازہ کے بیچوں بیچ لکڑیوں سے جھڑے چھوٹے چھوٹے کوئلوں کا ڈھیر بچھاتیں۔ اُن کوئلوں میں سُرخ لپٹیں اونگھنی سی جاگتی رہتیں۔ لمحہ لمحہ بڑھتی ہوئی آگ کے نیچے ان کے بدن دہکتے رہتے۔ روٹی توے پر پکا کر وہ ان چھوٹے چھوٹے دہکتے کوئلوں پر رکھتی تو پھلکا پھول کر کپا ہو جاتا۔ دونوں طرف کتھئی رنگ کے پھولوں والا پھلکا۔

پھلکے کے پھولنے کے ساتھ ہی بھابھی جی یعنی میری نانی کے چہرے پر ایک اطمینان اور بے فکری اُبھر آتی۔ بھابھی جی کے چہرے کا سکون اور اطمینان اس وقت مسکراہٹ میں بدل جاتا جب ہم لوگ ان کے نواسے نواسیاں۔ پوتے پوتیاں ان کے سامنے رنگین پیڑھیوں پر بیٹھ کر اور سامنے پیتل کی نفیس گول تپائیوں پر تھالی رکھ کر ان پھلکوں سے ٹکڑے توڑ توڑ کر دال سبزی اور دہی میں بھگو بھگو کر کھاتے۔

چولھے بھی کیا چیز تھے الہی چولھے۔ جو چاہو ان پر پکا لو۔ زیادہ آنچ یا ہلکی جیسی چاہے کر لو۔ سردی کے دن ہو تو چولھے کے پاس بیٹھ کر خوشگوار گرمی کا مزہ لو۔ رات کو بجھنے کے بعد بھی چولھے کئی گھنٹوں تک گرم رہتے تھے۔ جب کبھی میں آدھی رات کو اُٹھتی چولھے کو ہتھیلی سے ڈھانک کر عجیب سا احساس ہوتا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہو میرے دلار کا انتظار کرتا ہوا۔

ویسے رات چولھے کی بھوبھل میں اور بچے ہوئے کوئلوں میں دو چار اُپلے توڑ کر رکھ دیے جاتے اور اوپر سرسوں کے ساگ کی یا اڑد کی دال کی کڑھائیاں چڑھا دی جاتیں۔ صبح اُس ساگ یا دال میں سے ان تمام جنگلوں کی مہک آتی۔ جہاں کی لکڑیوں کی بھوبھل پر وہ رات بھر سنکتے رہے تھے۔

الہی مٹی کی الہی خوشبو
میرے لاہور شہر کی مٹی

صبح صبح چولھوں کو لیپا جاتا۔ ایک دم نئے نکور لش لش چمکنے لگتے مٹی کے چولھے پوتے کی

مہک سے تازہ۔ پوتا لگانے سے پہلے ان کی راکھ نکال کر تھالی میں ڈالی جاتی۔ کیا ساری دنیا میں ایسا کوئی پاوڈر ہے جو چولھے کی راکھ کی طرح برتن چمکانے کا دم رکھتا ہو۔ پیتل کی تھالیاں، چاندی کے گلاس، کانسے کے کٹورے، پتیلے۔ کڑھائیاں اور دیغیں سب چمچما اُٹھتے۔ نئے نکور ہو جاتے۔

بھابھی جی کہتیں، راکھ سے برتن جتنا رگڑو اتنی ہی اس کی عمر بڑھتی ہے کھل جاتا ہے برتن۔ ہنس پڑتا ہے۔ اور اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

گھر ٹوٹے تو چولھے بھی ٹوٹ گئے۔

گھر چھوڑ کر جاتے وقت، گھر کی ویرانی کی اطلاع دینے کے لیے گرہستنیں چولھا توڑ دیا کرتی تھیں۔

کس نے توڑ ڈالے سارے چولھے؟
کہاں بکھرا دیں ان کی الٰہی مٹی کی ٹھیکریاں۔
گھر ہی نہیں رہے تو چولھے کس کے لیے۔

سوچتی جا رہی تھی کہ اپنا گھر ڈھونڈ کر، اس سے اپنے بہت سے پرانے راز معلوم کر کے اس میں سے اپنا بچپن تلاش کر کے پھر میں شملہ پہاڑی جاؤں وہاں میں تمام بیر بہوٹیاں ڈھونڈھ لوں گی۔ لال سُرخ بیر بہوٹیاں جن کو مست چال سے چلتے ہوئے دیکھ کر میں اپنا بہت سا وقت بتا سکتی تھی۔ وہ سب ہی پگڈنڈیاں بھی، جن پر چلتے ہوئے مجھے محض زندہ ہونے کا پہلی بار احساس اور خوشی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کی بھی کھوج کروں گی جو سویرے سویرے زعفرانی ہوا کرتی تھی۔ دوپہر کو سفید بگلے کے پروں کی طرح کی اور شام کے وقت اس کا رنگ پیازی اور لال ہوتا تھا۔

وہ ہوائیں جو راوی کو گلے سے لگا کر آتی تھیں۔

لاہور کی سڑکوں پر میں اکیلی آوارہ گھومنا چاہتی تھی اور اپنے ماضی کو ٹٹول ٹٹول کر سونگھ کر کھوجنا چاہتی تھی۔ لیکن فی الحال تو میں دوستوں کی حفاظت اور حراست میں بیٹھی ہوئی چیمبرلین روڈ جا رہی تھی۔ اپنے صدیوں سے بچھڑے گھر سے ملنے اور میرا دل مردنگ کی طرح بج رہا تھا۔

موٹر جس سڑک سے گزر رہی تھی اس کے درمیان میں سے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ ''یہ نہر ہے اور اس کی دونوں سمت نئی کالونیاں۔ گلبرگ ہے یہ، لاہور کی سب سے بڑھیا، پاش کالونی۔

''نہر؟ یہ وہی نہر ہے جو اتنی چوڑی ہوا کرتی تھی؟ اور دونوں طرف جنگل ہوا کرتے

تھے۔''

لیکن نہر کہاں گئی؟ وہ تو بہت چوڑی تھی۔ ہم لوگ اس میں تیرا کرتے تھے، پانی ایک دم بلوری اور شفاف اور چما چم چمکتا، آس پاس کے جنگلوں میں ہم پکنک منایا کرتے۔

پیڑوں کے نیچے چولہے جلا کر پوریاں تلی جاتی تھیں۔ اور چھولے بنائے جاتے تھے۔ مال پورے اور کھیر پکائی جاتی تھی۔ بعد میں چھوٹے چھوٹے کاغذ، تمام راکھ، کوئلے اور سارا کچرہ چن کر بالٹیوں میں بھر لیا جاتا تاکہ کوڑا کباڑا، اُڑ کر نہر کے بلوری پانی میں نہ جا گرے۔ اپنی نہر کو صاف اور شفاف رکھنا سب کا دھرم تھا۔ جنگلات اور گھاس کو مہکائے رکھنا ہماری تہذیب اور تربیت کا ایک خاص جزو تھا۔

''نہیں یہ وہ نہر نہیں ہو سکتی۔'' میں سوچ رہی تھی۔

میرے احباب مجھے یقین دلا رہے تھے کہ یہ بالکل وہی نہر تھی۔ جب زندگی کروٹ بدلتی ہے۔ ترقی کرتی ہے، عالیشان عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں تو نہر کو تو ذبح ہونا ہی ہوا۔

اس نالے کے گندے پانی کو دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی پڑی بے چارہ اپنی بے نوری پہ روتا ہوگا۔ آس پاس اس کی لاج کو چھپانے والے درخت بھی تو نہیں تھے۔ تنگی سڑکوں کے بیچ بے چارہ برہنہ گندہ پانی......!

اب موٹر بدحواس اور اُداس سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا ہم کسی اور طرف آ گئے ہیں۔ پوچھا۔ ''آپ کو پتہ ہے نہ چیمبر لین روڈ کا؟ نسبت روڈ، اور پھر دائیں مڑ کر......!''

وہ ہنسے ''یہ ہم نسبت روڈ پر ہی تو جا رہے ہیں۔''

''نسبت روڈ؟ یہ تو نہیں ہے نسبت روڈ۔ وہ تو بہت چوڑی ہوا کرتی تھی۔ لش لش کرتی۔ سویرے پو پھٹنے سے ہی پہلے، موٹی، مضبوط لمبی جھاڑ دیں ان سڑکوں کی مٹی کو اور رات میں درختوں سے گرے پتوں کو اور کوڑے کباڑے کو صاف کرتی تھیں۔ پھر سقے پانی کی مشکیں، آدھی پیٹھ پر لٹکائے اور آدھی بغلوں میں دبائے لہرا لہرا کر چھڑکاؤ کرتے تھے۔ سڑکیں نہا دھو کر چمکنے لگتیں تھیں۔ بھیگی مٹی میں سے عطر کی خوشبو ہوا میں گھلنے لگتی تھی۔ خاص کر یہ نسبت روڈ اور ہماری چیمبر لین روڈ اور میرے اسکول والی ایبٹ روڈ۔

یہ دھول مٹی سے سنی، گڑھوں والی سڑک نسبت روڈ کیسے ہو سکتی ہے۔

ماضی کی دہلیز سے وابستہ پرانی یادیں میرے اندر بیٹھی تھیں۔ وہ حیران ہو کر من کے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ بھیگی آنکھوں سے۔

یہ نسبت روڈ ہی تھی، کیونکہ ہم وہی پرانی ملائم سی چڑھائی چڑھ کر نیچے اُتر رہے تھے۔ چوک کے پاس۔ لیکن جو اُتار کبھی خم دار اور لچکیلی ہوا کرتی تھی، اس میں اب گڈھے تھے اور مٹی تھی گڈھوں سے لگتے ہچکولے میرے خوابوں کو مجروح کر رہے تھے۔

چوک سے ہم دائیں طرف مڑے۔

چیمبر لین روڈ۔ یہ چیمبر لین روڈ؟ اس کی جیسی صاف اور شفاف سڑک تو تمام دنیا میں نہیں تھی۔ یہ سڑک تو اپنی خستہ حالی اور اُجڑے پن کی وجہ سے بے حد بے سہارا نظر آ رہی تھی۔ اور اس کے دو رویہ بے شاندار گھر کہاں گئے؟ چم چم چمکتے گھر؟ اور وہ چھتنار کے گھنے پیڑ؟ ان گھروں سے تو بدحواسی ٹپک رہی تھی۔ بے چارے سے۔ اُجڑے اُجڑے سے لگ رہے تھے گھر۔ دھول مٹی سے اٹے ہوئے جیسے راستہ کی تھکان سے نڈھال ہوئے مسافر ہوں۔ طویل راستہ طے کر کے آئے۔ ذرا تھکاوٹ اُتار کر، دم لے کر، جیسے پھر انھیں اُٹھ کر طویل سفر پر چل پڑنا ہو۔

نہیں۔ میں اپنا گھر نہیں پہچان سکی۔

مشکل سے تیس چالیس گھر تھے پوری سڑک پر بائیں طرف ہمارا گھر تھا۔ تب تقریباً سب ہی گھر ڈاکٹروں کے تھے۔ نیچے کلینک اور اوپر گھر۔ ایک اخبار کا دفتر تھا۔ جس کے باہر کافی موٹے تنے والا اور گھنی چھاؤں والا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔

ان گھروں کے باہر تو چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں یا اُجڑی اُجڑی خاموشی۔

ویسے اتنے لوگوں کی چہل پہل اور آنے جانے میں خاموشی تو ہو نہیں سکتی۔ یہ تو محض تمھارے وجود میں پھیلی خاموشی ہے جو آہستہ آہستہ اس باہر کے ماحول میں پھیلتی جاتی ہے۔

عجیب بات نہیں؟ جو گھر اتنے برس میرے خون میں گردش کرتا رہا تھا۔ میں اس کو ہی شناخت نہیں کر سکی۔

آگے نکل گئے۔ میں نے کہا۔ ”رکو اتنے آگے تو نہیں تھا ہمارا گھر۔ ہمارا تو نسبت روڈ کے اور گوال منڈی کے چوکوں کے درمیان میں تھا۔ یہ سامنے تو گوال منڈی کا چوک آ گیا ہے۔ پیچھے لوٹیں۔ پلیز۔

میں اپنی پوری کوشش سے اپنی آواز میں سے گلے کے رندھنے اور رونے کو روک رہی تھی مگر مجھے اپنے رونے کی صاف آواز سنائی دے رہی تھی وہ میرے سینے سے اُٹھ کر الفاظ میں گھل گئی تھی۔

انھوں نے کار پیچھے موڑی۔ ہاں شاید یہ۔ لیکن اس گھر کو کیا ہوگیا ہے؟ مجھے لگا کہ میرا وہ سیدھا شریف سا گھر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اور اس کی جگہ کوئی اور بدصورت سا لچا، غنڈہ سا مکان آ بیٹھا ہے۔ زبردستی اس کی جگہ گھیر کر۔

کار رکی۔ میرے قدم اس گھر کی طرف اُٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ یہ میرا گھر نہیں ہوسکتا۔ وہ تو بہت وسیع تھا۔ روشنی اور ہوا سے بھرا ہوا۔ سڑک پر سے چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر چوڑا سا سنگ مرمر کا چبوترہ تھا۔ پاس کے رگھبیر سنگھ جی کا چبوترہ تو ہمارے چبوترے سے بھی بڑا اور گورا تھا۔ وہ چبوترے کہاں گئے؟ گھر بالکل سڑک پر آ بیٹھا تھا۔ وہ اِدھر کیسے سرک آیا۔ سڑک تک لگی ہوئی دُکان تھی۔ ڈبل روٹی، انڈے، تیل، صابن اور چھٹ پٹ۔ یہ دُکان شاید اسی چبوترے کو گھیر کر بنائی گئی تھی۔

جھجکتے قدموں سے آگے بڑھی، میرے دوست نے دُکاندار سے کہا۔ ''یہ بی بی ہندوستان سے آئی ہیں۔ یہ گھر انھیں کا تھا۔ دیکھنے آئی ہیں۔''

''آ جاؤ'' اُس آدمی نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر میں بے یقینی بھی تھی اور ایک للکار بھی تھی۔ اب یہ گھر ہمارا ہے۔ آپ کیوں منہ اُٹھا کر آ گئیں؟ اس کو کندھے پر رکھ کر لے جائیں گی؟

میں یہاں کیوں آ گئی؟ اتنے برسوں بعد کیا تلاش کرنے چلی آئی؟ اپنے ماضی کو کیا ہم مٹھی میں پکڑ کر رکھ سکتے ہیں؟ کہ جب دل چاہے مٹھی کھول کر اسی طرح کا اپنی ہتھیلی پر پڑا دیکھ سکیں۔ ماضی تو ایک ننھی سی سنہری مچھلی ہے۔ ہتھیلی میں کس کر پکڑ لو۔ اگلے لمحہ جب ہتھیلی کھولو تو وہ مر چکی ہوگی۔ اس کے جسم کے سنہری اور زعفرانی رنگ آہستہ آہستہ آپ کی نظروں کے سامنے بدلتے جائیں گے۔ سرمئی، سیاہ اور سفید۔

تنگ سے بدبودار گلیارے میں سے گزر کر ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ نیچے چبوترے کے پاس کے کمرے سے ملحقہ گلیارہ جہاں دار جی کا کلینک ہوا کرتا تھا ایک۔ بڑا ہال مریضوں کے بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لیے تھا۔ ایک بڑی سی ڈسپنسری جس میں دو تین کمپاونڈر ہمیشہ دواؤں کی پڑیاں باندھ کر انھیں چھوٹے سفید لفافوں میں ڈال کر، ان پر مریضوں کے نام لکھ کر انھیں دیا کرتے تھے اور اندر دار جی کا کمرہ جس میں مریض باری باری جا کر اپنی بیماریوں کی تفصیل انھیں بتاتے تھے اور وہ اپنے موٹے سے رجسٹر میں کچھ کچھ کام کی باتیں لکھتے جاتے تھے اور مریضوں کو لٹا کر دیکھنے والا پچھلا چھوٹا کمرہ، اور اس کمرہ کے باہر کھلا وسیع آنگن جس میں کھڑے ہو کر دار جی آواز دیتے تھے ''جیت، پانچ سات گلاس لسی کے بھیج دو۔'' یعنی میرا نام

لے کر اصل میں وہ میری ماں کو ہی آواز دیتے تھے۔

وہ کلینک وہ سب کمرے وہ آنگن سب غائب تھا۔ اندھیرے میں سیلن میں ڈوبی سیڑھیوں پر ہم چڑھ رہے تھے۔ میں نے دیوار پر ہاتھ لگایا۔ پلاسٹر جھڑ رہا تھا۔ ننگی یا کہیں کہیں پلاسٹر سے آدھی ڈھکی ہوئی اینٹیں نم تھیں جیسے ابھی رو پڑیں گی۔

اوپر پہنچی تو ایک ادھیڑ عورت نے کمرے میں بٹھایا۔ یہ تھا وہ بڑا کمرہ جس کے باہر لمبی چوڑی بالکنی تھی اور دروازوں پر چکیں لٹکی ہوئی تھیں۔ نہیں یہ تنگ سا کمرہ وہ نہیں ہو سکتا۔

صاف ظاہر تھا کہ گھر کو کیک کی طرح بیچ میں سے کاٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ خاندان بڑھ گیا ہوگا۔ بھائیوں میں جھگڑے ہوئے ہوں گے۔ درمیان میں دیواریں کھڑی کر کر کے گھر کے ٹکڑے پر ٹکڑے ہوتے چلے گئے ہوں گے۔

نہیں۔ یہ نہیں تھا میرا گھر۔ اس گھر کی لاش کا محض ایک حصہ تھا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی چیز تھی، جو تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ ایشور کی طرح غائب اور سراب میں ڈالنے والی۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے آس پاس ایک پوری دنیا فنا ہو رہی تھی۔ نہیں میں اس وقت اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ گھبرا کر میں اٹھی۔ اُس عورت کے پاس جا کر میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہتھیلیوں میں چھپا کر آہستہ سے کہا ''آپا، اگر میں کل آؤں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔؟

عینک کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں میں شک ابھی بھی تیر رہا تھا۔ شک اور ایک عجیب سا سیلف ڈیفنس بھی جیسے وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر کو مجھ سے بچا لینا چاہتی ہو۔

کہنے لگی، ''ٹھیک ہے۔ کل سہی۔''

ہوٹل واپس آتے وقت میری آنکھیں درد سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

ابھی ابھی میں کسی میت سے اُٹھ کر آ رہی تھی۔

تیز دھوپ بڑھ گئی تھی اور سورج میرے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کر رہا تھا۔ انسان کی قوت برداشت ایشور کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ قوت برداشت اور انتظار جنھیں اس نے چپ چاپ انسان کی زندگی اور موت کے درمیان ٹکا دیا ہے۔ شام کو سیّد وارث شاہ کے مزار پر جانا تھا۔ وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ میرے میزبان مجھے وہاں لے جا رہے تھے۔ من بہت بھاری تھا۔ میں کار کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر کی سڑک جیسے ایک دریا تھی۔ جس میں پوری

دنیا بہتی جا رہی تھی۔ سانولے اور گہرے چہرے تھکے اور کھلے ہوئے چہرے۔ آبنوسی اور گلابی چہرے ایک ہی گمنام پانی میں بہتے ہوئے۔ ایک ہی بے نام ہوا میں سانس لیتے ہوئے۔ مسکراتے اور مایوس چہرے اخبار موڑ کے ہاتھ میں پکڑے، روٹی کے ڈبے ہاتھوں میں لٹکائے، ساتھ چلتے لوگوں سے گپیں مارتے۔ دل کی اور سیاست کی اور پڑوسیوں کی اور لڑکیوں کی باتیں کرتے، ہاتھوں کو جیبوں میں ڈال کر چل رہے۔ شلوار کرتا پہنے، سلیپروں اور چپلوں اور جوتوں سے فاصلہ طے کرتے۔ کہیں سے آرہے کہیں جا رہے۔ پیدل سائیکلوں پر، تانگوں پر، اسکوٹروں پر، موٹر سائیکلوں پر، کاروں پر، لیکن وہ دو گھوڑوں والی ٹمٹمیں کہاں گئیں جن میں بیٹھ کر سیدھے جنت میں جایا جا سکتا تھا؟

شہر میں پہلے تو اتنی آپا دھاپی اتنی جلد بازی نہیں ہوتی تھی۔ لوگ کس لیے بھاگے جاتے ہیں؟ جینے کے لیے؟ زندگی تو بڑی خاموشی سے، دھیمی چال سے، چپ چاپ چلا کرتی تھی۔ سدھی ہوئی زندگی۔ آج ان گلیوں بازاروں میں ساری زندگی کو ایک ہی سانس میں پینے کی۔ سب ہی سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ جانے کی۔ دھکم دھکا کرکے آگے گزر جانے کی جلدی تھی۔

دلّی شہر میں بھی تو اسی طرح ہی ہے۔

اس بات میں تو سب ہی شہروں کے چہرے یکساں ہیں۔ اچانک میرے ساتھ بیٹھے میزبانوں میں سے ایک نے کہا۔ ''یہ ہم راوی کے پل پر سے گزر رہے ہیں۔'' میں نے نیچے دیکھا۔ یہ تھی راوی؟ یہ تو وہ راوی نہیں تھی جو میری یادوں میں بسی ہوئی تھی۔ جس کی کنارے ساون کے مہینہ میں میلے لگتے تھے۔ بہتے پانی کا جشن راوی، جہاں میرے ماما جی کا بیٹا گورشرن ہمیں کشتی میں بٹھا کر سیر کرانے لے جایا کرتا تھا۔ کشتی میں بیٹھنا ایک عجیب خوف اور عجیب آزادی میں جینے کا نام تھا۔ پانی کے اوپر نرم نرم نازک سے ہچکولے کھاتی کشتی، کشتی کے نیچے پھیلے پانی کا پھیلاؤ، پانی جو سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور دریا کے اُس پار قبریں تھیں اور جھاڑ جھنکاڑ تھے اور جنگلی درخت تھے۔ اس پار انسانوں کا اور اُس پار روحوں کا بسیرا تھا۔

راوی کا دوسرا کنارا ہمیشہ پُراسرار لگتا تھا۔ اس روحوں کے شہر میں زندہ شہر کی آواز بہت دور سے آتی سنائی پڑتی تھی۔ جس میں راوی کی لہروں کا نرم سا شور اور راوی کے پیٹ میں سے آتی نرم گڑگڑاہٹ کی آواز بھی شامل ہوا کرتی تھی۔

قبروں کے پاس کھڑا ہونے پر لگتا تھا جیسے مردے پتھریلی نیند سو رہے ہوں۔ رتیلے کھوکھلے خوابوں میں کھوئے۔ ستاروں کی گلیوں میں سے اُڑتے ان کے خواب جیسے زمین کے

نیچے طلسمی دنیا کی جانب پرواز کرنے کے بارے میں ہوں ایسا لگتا تھا۔

یہ راوی تو وہ راوی نہیں تھی۔ دونوں کناروں پر ویرانی سی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ جنگل غائب تھا۔ بے چاری قبریں کہاں گئی ہوں گی؟ اور ان میں محو خواب لوگ کہاں گئے ہوں گے؟

تمام دنیا بے خواب ہو گئی تھی۔ ساری کی ساری لاہور کی دنیا۔ صرف اس میں میرے اپنے ماضی کے خوابوں کی تازہ قبریں کھودی جا رہی تھیں۔ میرے ہی ہاتھ کھود رہے تھے وہ قبریں۔ لہولہان ہوئے میرے ہاتھ۔

رات ہوٹل کے کمرے میں لیٹی تھی۔ کل کا انتظار۔ نہیں مجھے کوئی انتظار نہیں تھا تمام انتظار مایوس ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ شاید مر گئے تھے۔ باہر سے کچھ بہت رقیق سا جیسے دروازہ کی نچلی جھری میں سے اندر آ رہا تھا۔ کمرہ گیلے سیلے پن سے بھرتا جا رہا تھا۔ میرے وجود میں موجود تناور درخت پر ایک دم خزاں اتر آئی تھی۔ جھر جھر پتے جھڑ رہے تھے۔ من میں سناٹوں سے بھرا مرثیہ گونج رہا تھا۔ جیسے کوئی انگلی سے روح کا در چھو رہا ہو۔ جیسے ناخنوں سے کوئی روح کے بند دروازے کو کھرچ رہا ہو۔

ایک خیال بھٹکتا ہوا آیا اور میرے دل کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ کیا انسان کی زندگی لکڑی کے شہتیروں کی طرح نہیں کاٹی جا سکتی؟ اس کے ٹکڑے کرو تو سارے کے سارے ٹکڑے بے کار ہو جاتے ہیں۔ اگر ناپ تول کر کاٹو تو ان ٹکڑوں سے رنگ برنگے مونڈھے۔ میز، کرسیاں اور گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں نہیں بنائے جا سکتے؟ نہایت اوٹ پٹانگ خیال تھا۔ میں نے اسے جھٹک دیا اور جب پنجارہ میرے دل کو روئی کی طرح دھنک رہا تھا اس کی لے کے ساتھ مجھے نیند آ گئی۔

اگلے دن جب میری آنکھیں کھلی۔ میں نے کھڑکی کا دبیز پردہ ہٹا کر دیکھا ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ گھڑی دیکھ کر کیا کرنا ہے۔ میں نے سوچا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

وہ عورت میرے سامنے کھڑی تھی جسے میں کل صبح اپنے گھر میں ملی تھی۔ 'اپنا گھر' اپنے ہی خیال پر مجھے ہنسی آ گئی۔

کون ہو گی وہ۔

جب ملک تقسیم ہوا ہم شملہ میں تھے۔ تمام شب دار جی نہیں سوئے تھے بی جی بھی نہیں سوئی ہوں گی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دار جی بے چینی سے چلتے پھرتے رہے۔

کبھی کبھی وہ ریڈیو پر خبریں سننے کی کوشش کرتے۔

صبح انھوں نے کہا۔ ''میں تو لاہور جاؤں گا۔'' تیرے بوڑھے ماں باپ اس گھر میں بیٹھے ہیں، پتہ نہیں ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔''

بی جی نے کہا۔ ''میں تو نہیں جانے دوں گی۔ میرے ماں باپ بھی تو وہیں ہیں جوان کی قسمت میں لکھا ہوگا۔ ہو جائے گا۔ زندگی ہوگی تو خود آ جائیں گے۔'' بہت دیر تک تکرار ہوتی رہی۔ آخر دار جی چل پڑے۔ دھکے کھاتے۔ ریل کے انجنوں میں سفر کرتے موت کی گرم بازاری میں سے گزرتے وہ بارہ دن بعد امرتسر پہنچے پھر وہاں سے لاہور۔

میرے دادا دادی کیمپ میں مل گئے۔ اور نانا نانی کو انھوں نے بڑی مشکل میں ان کے گھر سے نکالا۔ اس وقت ایک ہجوم نے ان کے گھر کو گھیر رکھا تھا۔ اور انھیں گھسیٹ کر باہر نکال کر قتل کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

سب لوگ جب کیمپ میں جمع ہو گئے تو دار جی نے اپنے پرانے دوست ڈاکٹر محمد یوسف سے کہا۔ ''میرے گھر کا ذرا چکر لگا کر دیکھو کہ میں وہاں جا سکتا ہوں کہ نہیں۔ انھوں نے وہاں سے آ کر بتایا کہ ہمارے گھر پر امرتسر سے آئی ہوئی طوائفوں کا قبضہ تھا۔ وہ بہت خونخوار لوگ تھے۔ ان کے دلال غنڈے تھے جو ان کی نگرانی کرتے تھے۔ اب گھر جانا بہت مشکل تھا۔

دار جی نے کہا۔ ''پر گرو گرنتھ صاحب تو مجھے لا دو۔''

ڈاکٹر یوسف نے کہا۔ ''میں ٹیلیفون پر بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر انھوں نے ابھی......''

اور دو گھنٹے بعد تانگے پر بیٹھ کر ایک آدمی آیا۔ منہ میں پان، تیل سے چمکتے بال، گلے میں سونے کا لاکٹ۔ آنکھوں میں سرمہ، عطر سے مہکتا اس کا ریشمی کرتا اور پائجامہ، دار جی نے پہچان لیا۔ وہی ہوگا ان کا دلال رومال میں لپٹی ہوئی گرو گرنتھ صاحب کی بیڑ اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔

کل صبح میں نے جس عورت کو اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ امرتسر سے آئی ہوئی جسم فروش عورتوں میں سے تھی؟ یا وہ لوگ یہ گھر کسی دوسرے کو بیچ گئے تھے؟ اور بعد میں آنے والوں نے اس کے کئی ٹکڑے کر دیے تھے؟ یا امرتسر والیوں نے ہی اس کے کئی ٹکڑے کر کے ٹکڑا ٹکڑا بیچ دیا تھا؟

دل کا کوئی جذبہ چھان بین کر کے جاننے پرکھنے کی تیسری آنکھ مجھے بتا رہی تھی کہ وہ ان عورتوں میں سے ہی ہے۔ ضرور انھی میں سے تھی۔ تب ہی اس کی آنکھوں میں ایک فولادی

ڈھال سی تھی۔ اپنے آپ کو بچاتی ہوئی۔ ایک للکارسی۔ ''اے اجنبی عورت اگر تم نے میرے ماضی کو بے نقاب کیا تو میں بھی تمھیں چیر دوں گی۔'' اس کے چہرے پر ایک عجیب بے گانگی تھی۔ جب میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑا تھا تب بھی اس نے مخاصمانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ ذرا سی بھی نہیں پگھلی تھی۔

جہاں میں اپنے ماضی کو تلاش کر رہی تھی، وہیں وہ تہہ میں دبے اپنے ماضی کو پچھلی اندھیری کوٹھری میں چھپا دینا چاہ رہی تھی۔ کسی زمین دوز تہہ خانے میں اس کی گٹھری باندھ کر پھینک دینا چاہتی تھی کہ خبردار اگر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔ ''میری اپنی مجبوری تھی۔ اس کی اپنی مجبوری تھی۔

سب کے زخم اپنے اپنے جسموں کی دیواروں میں قید ہیں۔ کبھی بھٹی کے دانوں کی طرح بھونتے، چٹختے، کبھی رستے، کبھی ٹیستے۔ کبھی کھرنڈ سے ڈھکے۔ پھر اپنی ہی انگلی کے ناخن انھیں کھرچ دیتے ہیں۔

بیالیس برسوں میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ بیالیس برسوں میں ایک صدی کروٹ لے لیتی ہے۔ بیالیس برسوں میں دنیا میں کیا کیا ہو گیا ہے۔ ویت نام، افریقہ، کوریا، ہندوستان پاکستان کی جنگیں، چین سے دوستی اور پھر لہو آمیز دشمنی اور پھر دوستی کے لیے بڑھتے ہاتھ ایران اور عراق کی لمبی جنگ، روس کی شکست و ریخت یعنی ہمارے بچپن اور چڑھتی جوانی کی پشت ٹوٹ کر چور چور ہونا۔ اسرائیل اور فلسطین کے لہو لہان جھگڑے، بوسنیا ہرزیگونیا میں بہتا خون۔

دنیا کے کسی بھی کونے میں جس کسی کے جسم پر زخم ہوتا ہے اس کا درد تو اس دھرتی پر رہنے والے ہر فرد کو بھوگنا پڑتا ہے۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ حساس افراد کو زیادہ درد ہوتا ہے اور جسے دنیا میں ہو رہے کسی بھی تشدد کی کوئی خبر نہیں اس پر بھی کسی نہ کسی نظر نہ آنے والی شکل میں اثر پڑتا ہے۔

آنکھ کے دیکھنے کی حد ہی ہماری دنیا طے کرتی ہے۔

بیالیس برسوں میں اس عورت کی زندگی بھی شاید بدل گئی ہوگی۔ کیا خبر اس نے اپنے اسی دلال سے بیاہ کروالیا ہو اور اب اس کا جوان بیٹا مکان کے نیچے انڈوں اور ڈبل روٹیوں کی دکان چلا رہا ہو۔ کیا معلوم باقی کے ساتھنوں کو انھوں نے ہیرا منڈی کے چوباروں پر فروخت کر دیا ہو۔

ہیرا منڈی جس سے تعارف صرف منٹو کی کہانیوں کے ذریعہ ہوا تھا۔

ہیرا منڈی ابھی بھی ہوگی اسی طرح؟

سچ مانو میں اس گھر میں واپس جانا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا یہ ہی بات صرف زخموں کو کریدنے والی ہے۔ پھر سوچا شاید اس شہر میں یہ میری زندگی کا آخری پھیرا ہو۔ پہلے بیالیس برس گزر گئے ہیں۔ انسان کی نصف سے زیادہ عمر۔ میں نے ٹیکسی لی اور چیمبر لین روڈ کی طرف چل دی۔

گھر بھی کیا چیز ہے میں سوچ رہی تھی۔ انسان اسے بناتا ہے۔ پھر اس میں مقید ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو دھوتا، پونچھتا اور چمکاتا رہتا ہے۔ اس کی روح قطرہ قطرہ اس گھر کی دیواروں میں سمائی رہتی ہے۔ وہ گھر اس کی گزر رہی زندگی کا چشم دید گواہ بن جاتا ہے۔ سب ہی سکھ دُکھ، سب ہی درد۔ سب خوشیاں اور قہقہے سب اُداسیاں اور مسکراہٹیں۔ سب ہی نغمے اور آنسو وہ گھر چپ چاپ سنتا دیکھتا اور محسوس کرتا رہتا ہے۔

انسان کی روح کی پرواز اس گھر کی چھتوں پر منڈلاتی رہتی ہے۔ چاہے وہ اس گھر سے کتنا بھی دور چلا جائے۔ اس گھر پر جو آسمان ہوتا ہے۔ اس طرح کا دنیا بھر میں کہیں نہیں ہوتا۔ رات جب تارے سفر کرتے ہیں تو اس گھر کی منڈیروں سے ان کے فاصلوں کو دیکھ کر ٹھیک وقت ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ وہ گھر کھو جائے تو وقت بھی کھو جاتا ہے کیونکہ گھر اجنبی ہوتے ہیں، تاروں کی چال کی منک اور رفتار بھی گڑبڑا جاتی ہے۔ تاروں کے ساتھ چلتا وقت راہ بھول کر بھٹک جاتا ہے۔

میں سوچ رہی تھی کہ زندگی کا بہاؤ کیسے بدل جاتا ہے۔ ایک آدمی کسی غلط یا ٹھیک خواب کے سہارے ایک طرف چلنا شروع کرتا ہے اور لوگ اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور آنے والی نسلوں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔

ویسے تقدیر ہے بھی کیا؟ اور وہ کیا سچ مچ بدل جاتی ہے؟

جناح۔ ہٹلر۔ مسولینی، اسٹالین۔ سب کے اپنے اپنے خواب تھے۔ اپنی نگاہ میں صحیح اور ٹھیک۔ اپنے اپنے طریقہ سے دنیا کو بدل دینے کے خواب۔ اس وقت وہ پوری ایمانداری سے بہتر دنیا کے بارے میں، اور اپنے عقب میں آنے والوں کے خوبصورت مستقبل کے بارے میں ہی سوچ رہے ہوں گے۔ نہیں؟

نتیجے میں چاہے خون کے دریا بہہ چلیں۔ زمین کو چاقو سے کاٹ دیا جائے، گیس چیمبروں میں ساٹھ لاکھ لوگ قتل کر دیے جائیں، کچھ بھی ہو۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

وہ جوان سڑکوں پر چھرے لے کر گھوما کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کل کیا ہوگا؟ وہ وقت ہی ایسا تھا۔ موت سے عشق تھا اس وقت کو۔ درندگی اور حیوانیت کا وہ موسم گزر چکا ہے۔

کیا سچ مچ گزر چکا ہے؟ ان میں سے کئی تو قبروں میں جا لیٹے ہوں گے۔ انسان مرجاتا ہے صرف اس کے دل کی نفرت اور محبت اگلی نسلوں کی سانسوں میں اُتر جاتی ہے۔ لیکن کون چھاتی ٹھونک کر کہہ سکتا ہے، اسی کٹی ہوئی دھرتی کے دونوں طرف بدحالی، دکھ سکھ اور خواب ابھی تک مشترک نہیں؟

ویسے غور کریں تو تاریخ ہے ہی کیا؟ ایک دھند۔ گہرا سیاہ کہرا جسے اپنی مرضی کے مطابق پکڑ کر ''مولڈ'' کرلو اور جو دل چاہے وہ شکل بنادو اصلی تاریخ تو وہ ہے جو وقت کے لگاتار ٹوٹتے کناروں کی طرح جھڑ جھڑ کر بھرا کر پانی میں بہہ جاتی ہے۔ اس ٹوٹ گئی اور بہہ گئی تاریخ میں ہمارا اپنا وجود اور اپنی شناخت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہم خود تاریخ کا ایک ورق ہیں جو کل ہوا میں پھڑ پھڑاتا ہوا ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

زندگی کے پتے لگاتار گرتے رہتے ہیں۔ خاک اور کھاد میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

چیمبرلین روڈ پر میں نے ٹیکسی روکی۔ پوچھا۔ تھوڑا انتظار کرو گے۔ واپس ہوٹل ہی جانا ہے۔ وہ مان گیا۔ خوش خوش مان گیا۔

میں نے گھر کی طرف دیکھا۔ رُکی ہوئی ہوا اور ہوا کے لیے کھلی کھڑکیاں جیسے جماہیاں لے رہی تھیں۔

میں تھکے تھکے قدموں سے اندھیری اور سیلن بھری سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اوپر وہی عورت ملی۔ کروشیا سے لیس بن رہی تھی۔ خالص گھریلو۔ مہذب۔ سگھڑ، گرہستن کا نقاب پہننے میں کروشیا سے لیس بُننے کا خاص رول تھا۔

آج اس کی آنکھوں میں فولادی دیوار نہیں تھی۔ صرف ایک بیگانگی اور اپنے آپ کو مجھ سے محفوظ رکھنے کی کوشش تھی۔ منہ زور اور چیلنج کرتی ہوئی کوشش۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ بی جی کا کمرہ کہاں تھا؟ جس میں سے صبح صبح سکھ منی صاحب کا پاٹھ پڑھنے کی آواز آیا کرتی تھی۔ دھیمی دھیمی موسیقی آمیز اور ایک لَے کے ساتھ۔

وہ غسل خانہ کہاں تھا؟ جس میں سے میرے دادا جی کے نہاتے ہوئے گنگناتے ہوئے شبد پڑھنے کی آواز آیا کرتی تھی۔ آواز جو گرمیوں کے موسم میں سپاٹ اور ہموار ہوتی اور سردی کے موسم میں کسے ہوئے رباب کے تاروں کی طرح جھنجھناتی۔ کانپتی۔

کہاں تھا وہ باورچی خانہ جس میں صبح سویرے سے لے کر دیر رات تک کچھ نہ کچھ پلتا رہتا تھا۔ برتن رگڑ کر چمکائے جاتے تھے۔ پک رہے پکوانوں کی خوشبو سارے گھر میں ٹہلتی ہوئی سرگشتی کرتی۔

اس کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے گھر میں وہ سب کچھ مل پانا ناممکن تھا میں نے اس عورت سے پوچھا۔ ''میں ذرا چھت پر ہو آؤں؟''

اس نے کہا۔ ''ہو آؤ جب تک میں شکنجبین بناتی ہوں۔''

سیڑھیوں کی دیواروں کو میں ہتھیلیوں سے سہلاتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ چاہے اور کچھ نہ ملے وہ آسمان تو ابھی بھی نیلے تھال کی طرح اس گھر پر اوندھا ہوگا اور چڑیاں کوے، پیٹ پھلا کر گانے والے وہ سارے کبوتر، گول گول گھوم کر زندگی کا جشن منانے والے۔

اوپر جا پہنچی۔ چھت پر۔ چھت بھی کافی سکڑ چکی تھی۔ شاید چھت کے بہت سے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت دور تھا۔ اور لاپرواہ، بے خبر نیلے پن میں ایک غبار سا گھلا ہوا تھا۔ مٹی تھی؟ دھواں تھا یا اس شہر سے بچھڑے لوگوں کی آہیں تھیں۔

چھت کی منڈیریں کہاں گئیں اب کبوتر کہاں بیٹھ کر جشن مناتے ہوں گے؟ چڑیاں کہاں بیٹھ کر دانے چگتی ہوں گی؟

کہاں گئیں وہ تمام چڑیاں جنھیں میرے دادا جی روٹی کا چورما بنا کر کھلاتے تھے؟ ایک بدحواس سا غبار چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور بس۔

اچانک مجھے ایک جھری بھری، اور شکستہ دیوار میں کچھ ہلتا سا نظر آیا۔ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتی میں نے اسے دیکھا تھا یا محض احساس ہی ہوا تھا اس کا۔ اب سوچتی ہوں تو سب کچھ گڈ مڈ سا ہو جاتا ہے۔

یہ وہی دیوار تھی جس کے عقب میں لکڑی کوئلہ کا کوٹھا ہوا کرتا تھا۔ ایندھن والا کمرہ۔ جس کے دروازے ہوا چلنے پر دھیرے دھیرے چرمراتے تھے۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہا ہو۔ اسی کمرے میں رات کو مجھے بلیوں کی آنکھیں ڈرایا کرتی تھیں۔

میں نے اس دیوار کو چھوا۔ مجھے لگا، سفید بھیگی چادر میں لپٹے دار جی، میرے والد اس دیوار میں سے نکلے اور میرے پاس سرک آئے۔ پھر بی جی، میری ماں اس میں سے نکلیں: بھیگی سفید چادر اوڑھے، پھر میرے دادا جی، دادی جی چپ چاپ نکلے۔ پل بھر خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے اور پھر چپ چاپ اسی دیوار میں جا کر اس کا حصہ بن گئے۔

میں کانپتی ہوئی اس دیوار کی اینٹوں کو ہتھیلیوں سے سہلا رہی تھی۔ میرے اندر سے ایک سیلاب اُٹھ کر میری آنکھوں میں اُمڈتا آ رہا تھا۔ اس دیوار میں میرا ماضی ہی نہیں میرے خاندان کے وہ تمام لوگ چنے ہوئے تھے جواب نہیں تھے۔ چاہے ان کے جسم بہت دور پہلے وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ دور بے گانے شہروں میں جا بسے تھے۔ ان کی روحیں انھیں دیواروں میں دفن ہو گئی تھیں۔ دار جی میرے والد جن کے بال پندرہ اگست کو شب میں شملہ کے ایک مکان کے اندر آدھے سفید ہو گئے تھے۔ بی جی جو پیڑھی پر بیٹھی ابھی بھی باورچی خانہ میں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ بھائیا جی جو دن رات پاٹھ کرتے تھے۔ اور اپنے رب سے ہنس ہنس کر مذاق کرتے تھے اور چھت پر روٹی کو چور چور کر کے چڑیوں کو کھلاتے ہوئے ان سے چھوٹی چھوٹی لاڈ بھری گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اور بی جی، میری دادی جی جو دودھ کی ملائی میں بیسن گھول کر اپنے ملائی کی طرح ملائم گورے چہرے پر، ہاتھوں پر، پیروں پر، پنڈلیوں، کلائیوں پر اُبٹن ملا کرتی تھیں۔ جسبیر جس کی ٹھنڈی توتلی باتیں کرتے ہوئے کانپا کرتی تھی اور میں خود جو چق کے پیچھے کھڑی نیچے سڑک پر سے گزرنے والے لوگوں کے دریا کی لہریں گنتی رہتی تھی۔ اور دیکھا کرتی تھی، آدھی رات کو سبزی سے بھری ہوئی گاڑیوں کے نیچے لٹکتی لالٹینوں کی روشنی کو جو گڈھے کے کرچ مرچ چلتے پہیوں کے ساتھ ہی عجیب اندھیرے اُجالے کی رنگولیاں سڑک کے بدن پر بکھیرتی رہتی تھیں۔

تب ہی خالی آسمان میں ایک چیل اُڑتی ہوئی گزری۔ ہلکے نیلے اور مٹمیلے سمندر میں تیرتی ایک بڑی اور کالی مچھلی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہتی ہوئی سی۔ تلاش کرتی کہ سمندر کا کوئی دوسرا کنارہ بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ اس کی سخت اور کرخت چیخ نے خالی کھوکھلے آسمان میں جیسے خنجر گھونپ دیا۔ لوہے پر بجتے لوہے کے ہتھوڑے کی آواز۔

من دھواں دُھواں ہو گیا۔

میں نیچے اترنے لگی۔

وہ کھنڈر ہوا گھر۔ جیسے میرے گھر کی لاش تھی۔ بے کفن۔

میری آنکھوں میں جو مری ہوئی مچھلیوں کی طرح سطح پر تیر آئے تھے وہ خواب تھے اس گھر کے جو برسوں پہلے بچھڑ گیا تھا، ان گھروں کے جو ابھی کسی نے نہیں دیکھے تھے۔ ان گھروں کے جن کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں میں شام تک یہاں نہیں رکوں گی۔ اب اس گھر پر سے کووں کے ڈاریں اُڑتی ہوئی اپنے گھروں کو نہیں جاتی ہوں گی۔

یہ حیرانی تھی؟ افسوس تھا؟ دُکھ تھا؟ پچھتاوا تھا؟

پتہ نہیں۔

شاید ان سب ہی غموں سے بڑا غم تھا جس کے لیے ابھی لفظ نہیں تراشے گئے۔

میرے اندر میرے خوابوں کی کٹی گردن زمین پر لڑھک پڑی تھی اور اس کا بدن ابھی بھی آہستہ آہستہ کپکپا رہا تھا۔ کٹی ہوئی گردن میں جڑی حیران آنکھیں اپنے ہی سر بریدہ بدن کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور بے جان ہو رہے بازوؤں کو اپنے ہی جسم سے رِستے ہوئے خون نے تربتر کر دیا تھا۔

موت سے بھی پہلے اپنے ہی لہو میں ڈوبے بازوؤں سے میں پرواز کر رہی تھی۔

میں ہوٹل واپس لوٹ رہی تھی، گلیوں، سڑکوں پر پرانی روحوں کے چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔ روحیں بانٹ کر رہی تھیں۔ بدحواس میلی، گندھوں سے بھری بدرنگ سڑکوں کو۔ روحیں گزرے زمانے اور مرے ہوئے خواب۔

پورا شہر جیسے ایک گونگا تھا جس نے اپنے پیٹ میں ان تمام بے نام آوازوں کی گونج چھپائی ہوئی تھی جواب بھی ان گلیوں میں بھیگی ہوئی دھند کی طرح، گرم بھاپ کی طرح بے آواز بہتی جا رہی تھیں۔

OO

چوراسی کا نومبر

وہ بہت سیاہ اور بہت سرخ دن تھے۔ایک عجیب دہشت سے گھرے ہوئے، خوف اور دہشت سے تھر تھر کانپتے، لرزتے۔ سانس روکنے والی ایک گھٹن، زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی تھی، سیاہ۔

نومبر کا مہینہ تھا، نومبر کے شروع کے دن تھے وہ، چوراسی کا نومبر۔

ویسے شہر تو اکیس اکتوبر سے ہی سُن سا پڑا ہوا تھا، وہ عورت جس نے اتنے برس ملک پر حکومت کی تھی، جس نے ابدالی کی طرح ہر مندر پر حملہ کیا تھا، جس نے ملک کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ کر بادشاہت کی تھی، لوگ دیوی کی طرح جس کی پوجا کرتے تھے، اور پوری دنیا میں اس کے حسن اور دانشمندی کے چرچے تھے، وہی ملکہ عالیہ قتل ہو گئی تھی۔

قتل ضرور بری بات ہے، بری اور بھیانک، لیکن اس جیسی ملکہ یا بادشاہ کا قتل ہونا اس ملک میں کوئی انہونی بات نہیں، یہاں کئی بادشاہوں نے اپنے باپوں کو قید کر کے قتل کر کے، بھائیوں کو تہہ تیغ کر کے حکومت کی ہے اس ملک میں وہ بھی قتل ہوا تھا جس کو سب ''راشٹر پتا'' کہتے ہیں لیکن کسی بھی قتل کے بعد اس طرح معصوم اور بے سہارا لوگوں پر موت نہیں منڈلائی تھی۔

لوگوں کو چوراہوں پر قتل کیا جا رہا تھا، درندوں کے ہجوم نیتا لوگوں کی قیادت میں گلی محلہ گھوم رہے تھے، گھر لوٹے جا رہے تھے، جلائے جا رہے تھے، لوگ مارے کاٹے جا رہے تھے۔

اسی طرح ہوا تھا، بالکل اسی طرح، جب اس ملکہ کے باپ نے ملک کو بوٹلی چھری سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا منظور کر لیا تھا، تب بھی اسی طرح لوگوں کے سر پر پاگل جنون سوار ہوا تھا، تب بھی اسی طرح گھر جلائے گئے تھے، تب بھی اسی طرح چاقوؤں سے پیٹ پھاڑ کر آنتوں کو برہنہ سڑکوں پر راستوں پر، پگڈنڈیوں پر بکھرا دیا گیا تھا۔

تب بھی شہروں پر، گاؤں پر خوف کے گدھ منڈلایا کرتے تھے، آج سینتیس برسوں کے بعد پھر وہی کچھ ہو رہا تھا۔

میں اور میری بیٹی ار پنا دروازے بند کر کے بیٹھی رہیں، اکتیس اکتوبر، پہلی نومبر، دو نومبر، تین نومبر۔

ہمسایوں نے نیچے گیٹ پر لگی ہماری نیم پلیٹ توڑ دی تھی، ہم کو فون پر کہتے رہے۔ ''فکر نہ کرو، ہم آپ کی حفاظت کے لیے بیٹھے ہیں۔''

لیکن جب تین نومبر کو جمنا پار کی بستیوں میں ہزاروں افراد کا قتل عام ہوگیا تو گھر میں بزدلوں کی طرح چھپ کر بیٹھنا ناممکن ہوگیا۔

ٹی وی پر ریڈیو پر اعلان ہوگیا تھا کہ تمام شہر کو ملیٹری کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

ملیٹری کا پہرہ ہے، تو گھر سے کس طرح نکلیں گے، جمنا پار جانے کے لیے تو پل پر سے گزرنا پڑے گا، پل پر تو ملیٹری والے روک لیں گے، کہیں گے تمھیں اُدھر کس کام سے جانا ہے۔

دیکھا جائے گا، جو بھی ہوگا، دیکھ لیں گے، پر اس طرح گھر میں جان بچا کر، چھپ کر تو نہیں بیٹھا جا سکتا، جب لوگوں کو سڑکوں پر قتل کیا جا رہا تھا، سروں پر سے سریے مار کر۔ زندہ لوگوں پر پیٹرول ڈال کر جلایا جا رہا تھا، گردن میں مٹی کے تیل کے بھرے ہوئے ٹائیر ڈال کر آگ لگائی جا رہی تھی، گھر پھونکے جا رہے تھے، بیٹوں اور شوہروں کی لاش کے پاس ہی، گھروں سے نکلتی لپٹوں اور دھوؤں کے مرغولوں کے درمیان برہنہ سڑکوں پر دھول اور خون سے سنی گلیوں میں عورتوں کی عصمت دری کی جا رہی تھی، بستیوں کی بستیاں اُجاڑ کر کھنڈر بنائی جا رہی تھیں، موت اور درندگی کا وحشی جانور گلی گلی شور مچاتا ہوا گھوم رہا تھا، اس قتل و غارت کے دوران صرف اپنی ہی جان بچا کر بیٹھنا ناممکن تھا۔

ٹی وی اور ریڈیو پر بس مرنے والی ملکہ کے لفظ بار بار دہرائے جا رہے تھے۔ ''میرے خون کی ایک ایک بوند'' خون، خون، خون۔!

میں اور میری بیٹی ار پنا گھر سے نکل پڑے، ڈرائیور ہندو تھا اور یہ خیال ہوا کہ اس کا ہندو ہونا ہمارے لیے ڈھال کا کام کریگا۔

اس سال شروع نومبر سے ہی ٹھنڈ پڑنے لگی تھی، سو ہم نے سوچا کہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان، چائے کے ڈبے، چینی، خشک دودھ کے پیکٹ اور کمبل لے جائیں، کمبلوں کے لیے ہم آزاد مارکیٹ کی طرف چلدیے، کیونکہ وہاں ملیٹری کے موٹے کمبل ملتے ہیں۔

چتر گپت روڈ سے پہاڑ گنج والی سڑک پر داخل ہوتے ہی چوراہے پر، پہاڑ گنج کے تھانے کے سامنے ہی ایک شور مچاتا ہجوم چیختا چنگھاڑتا نعرے لگا رہا تھا۔ ''خون کا بدلہ خون ہے۔''

اُسی ہجوم میں سے سرکتی ہوئی ہماری موٹر جس وقت گزری، برف کا ایک گولہ میرے گلے

میں آ کر پھنس گیا، یہ ہی خوف ہے۔ انسانوں سے خوف، موت کی دہشت، باہر کھڑے وحشی درندوں کے ذریعہ پاس میں بیٹھی بیٹی کو باہر کھینچ لے جانے کا ڈر۔

کمبل لے کر ہم نے جمنا کا پل پار کیا۔ نہ کوئی ملیٹری کا جوان، نہ کوئی سپاہی، کوئی نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی پگڑی کہیں نظر آ رہی تھی۔ کوئی بھی سکھ سڑک پر نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ پوچھتے پوچھتے ہم گاندھی میموریل اسکول جا پہنچے۔ گیٹ کے باہر پولس کا ایک ٹرک تھا، اس میں دو تین پولیس والے آرام سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ گیٹ کے اندر انسانوں کا ایک ہجوم سا تھا۔ اتنے لوگ اس اسکول کی عمارت کے اندر، تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

لوگ خاموش کھڑے تھے۔ کونوں میں، پچھلی دیواروں سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے عورتیں، بچے مرد، بزرگ۔

کسی نے دور بھیڑ میں سے شاید پہچان لیا۔ دونوں بانہیں اوپر اٹھا کر اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں پکارا ''بی بی جی خون کے چوبچے نہیں اب تو کنویں بھر گئے ہیں۔''

اس نے شاید ہرمندر پر ہوئے حملہ کے بعد لکھا میرا آرٹیکل ''لہو کے چوبچے'' پڑھا ہوا تھا۔ ابھی مشکل سے پانچ مہینہ تو ہوئے تھے، اور اب۔

موٹر کی تو جگہ ہی نہیں تھی، پر انھوں نے کہا، نہیں، اسے اندر لے آؤ، گیٹ سے ذرا اندر کرلو، باہر کیا خبر کوئی ابھی آگ لگا دے۔

وہ لوگ خود سمٹ سکڑ گئے، ایک ایک انچ پیچھے سرک کر انھوں نے موٹر کے لیے جگہ بنالی۔ کیسے لوگ تھے، اپنا سب کچھ لٹا کر بھی انھیں میری موٹر کی فکر تھی۔

ہم نے سامان اتارا، وہ بولے ''نہیں لنگر تو گرو کا چل رہا ہے۔ کوئی کمی نہیں، یہ تو آپ نے بے کار میں تکلیف کی۔

اسکول کی عمارت کے عقب میں جو کبھی کھیلنے کا میدان ہوا کرتا تھا، بڑے بڑے چولھے جل رہے تھے، اوپر دیغیں چڑھی تھیں۔ دال پک رہی تھی، بڑے توے پر روٹیاں پک رہی تھیں۔

''لیکن یہ سامان یہاں کس طرح پہنچتا ہے۔''

اسکول کے میدان میں بیس پچیس زخمی آدمی زمین پر لیٹے ہوئے تھے، صرف ایک کے نیچے اس کی بیوی نے اپنا دوپٹہ بچھا رکھا تھا، اور وہ ننگے سر گھٹنوں کو چھاتی سے لگائے اس کے آس پاس بیٹھی رو رہی تھی۔

صبح ان لوگوں کو ٹرک میں ڈال کر پولس والے اسپتال لے گئے تھے، لیکن اسپتال والوں نے انھیں داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا، کہا تھا وہ لوگ ہمارے اسپتال کو آگ لگا دیں گے، وہ لوگ، یعنی حملہ کرنے والے جنونیوں کا ایک ہجوم۔

کسی کی ٹانگیں اور بازو جلے ہوئے تھے، کسی کا سر پھٹا ہوا تھا، کسی کی ٹانگیں اور ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے، خوفناک منظر تھا، ایک عجیب بے سہارا پن، ایک عجیب دہشت۔

ہم نے واپس آ کر کناٹ پلیس سے ڈیٹول کی شیشیاں، پٹیاں اینٹی سپٹک کریم کی ٹیوبیں خریدیں اور واپس جا کر نازیوں کی طرح ان کے زخموں کو ڈھکنے کی کوشش کی۔

اور پھر پہلی بار، ایک عجیب سی سڑاندھ بھری بد بو ٹھہری ہوئی ہوا میں گھلی ہوئی محسوس ہوئی۔ ظاہر ہے جو لوگ یہاں ٹوکریوں میں بند مرغیوں کی طرح دن رات پڑے ہوئے تھے۔ وہ کہیں تو پیشاب پاخانہ کرتے ہوں گے۔ اور یہ عمارت چاروں طرف سے بند تھی، باہر کا گیٹ کھلا تھا، پر کوئی بھی اس گیٹ سے باہر جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

یہ ایک ''گھیٹو'' تھا، اسی طرح وہ یہودی بھی رہتے ہوں گے جو نازیوں کے ظلم و بربریت سے ڈر اکر پولینڈ کی اجڑی بستیوں میں آ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ جو موت کے خوف سے شہروں کے نیچے بنے گندے پانی کے نالوں میں بھی چھپ رہے تھے، زمین کے نیچے تہہ خانوں میں بھی اور چھتوں پر بنی پڑچھتیوں میں بھی۔

رات ہو گئی تھی۔

ہم وہاں سے نکل کر سیدھے خوشونت سنگھ کے گھر پہنچے، رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے، اس وقت کوئی رشتہ دار، کوئی دوست خوشونت سنگھ کے گھر نہیں جا سکتا۔ نو بجے کے بعد سب بند۔

لیکن یہ قیامت کا دن تھا۔ آج کے دن تمام قاعدے قانون کا خوف ختم ہو چکا تھا۔

خوشونت سنگھ نے دروازہ کھولا۔

میں کسی کے سامنے روتی نہیں۔ پر اس رات تمام دن کی مایوسی۔ بے سہارا پن، خوف اور دہشت سب یکبارگی بہہ چلے۔ میں ان کے کندھے پر سر رکھ کر دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ارپنا چپ چاپ اپنے آنسوؤں کو دوپٹہ سے پونچھے جا رہی تھی۔

میں نے خوشونت سنگھ کو سب کچھ بتایا۔ وہ چپ چاپ، حیران اور گمبھیر خاموشی کے ساتھ

سن رہے تھے۔

میں نے کہا ''گاندھی میموریل اسکول کے بالکل پاس شیام لال کالج کی بلڈنگ ہے۔ اسکول کالج تو سب بند پڑے ہیں۔ اگر آپ لیفٹیننٹ گورنر کو فون کر کے وہ کالج کھلوا دیں تو ان دس پندرہ ہزار لوگوں کو ذرا سی بیٹھنے کی اور ذرا سی کمر سیدھی کرنے کی جگہ مل جائے گی۔

خوشونت سنگھ نے کہا۔ ''وہ تو گزشتہ تین چار دنوں سے گورنر سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن آج کل کسی بھی منسٹر یا پولیس افسر کو یا گورنر کو فون کرو تو جواب ملتا ہے کہ صاحب ہے ہی نہیں۔''

آج کل کوئی بھی کہیں نہیں تھا۔

یہ سچ تھا۔ پورا ملک ایک طوفان میں پھنسا ہوا تھا اور بادلوں کی جگہ خون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ سورج غائب ہو چکا تھا۔ آسمان نے سُرخ غبار کے عقب میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

خوشونت نے کہا۔ ''میں پھر کوشش کروں گا۔ رات میں پھر فون کروں گا۔ اس کے گھر فون کروں گا۔ جو ہو گیا ہے، اس سے زیادہ اور کیا ہو جائے گا۔ مجھے پھانسی لگا دے گا۔ دو دن تک تو میں بھی سویڈیش سفارت خانہ میں پناہ گیر رہا ہوں۔ میرا خاندان بھی، کمل اور میں، مالا اور روی، اور نینا، ہم سب۔ آج ہی گھر آئے ہیں کیونکہ سرکار اعلان کر رہی ہے کہ شہر کو ملیٹری کے حوالے کر دیا گیا ہے، اب کچھ نہیں ہوگا۔''

''ملیٹری؟ ہمیں تو تمام دن کہیں کوئی ملیٹری نظر نہیں آئی۔ گاندھی میموریل اسکول سے مشکل سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر دنگائیوں کے ایک ہجوم نے بارہ لوگوں کو قتل کیا ہے۔ پہاڑ گنج میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا۔ کیونکہ ایک خونی ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ان کے درمیان میں سے ہم گزرے تھے۔ جمنا کا پل چار بار کراس کیا ہے۔ کہیں بھی کوئی ملیٹری سیلٹری نہیں۔ آپ اپنا خیال رکھنا۔ دروازہ بند رکھنا۔

رات کے ڈھائی بجے تھے، جس وقت خیال آیا کہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے بے حد شریف ڈاکٹر ہر بنس سنگھ دلیر آج کل گیانی ذیل سنگھ کے پرسنل ڈاکٹر ہیں۔ آدمی اپنے عہدے اور رتبہ کی وجہ سے بے شک اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے، اور چاہے کتنا بھی بے بس کیوں نہ ہو جائے، اپنے ڈاکٹر کی بات نہیں ٹال سکتا۔ سو میں نے ڈاکٹر دسیر کو فون کیا۔ ''گیانی جی سے کہیے، کم سے کم شیام لال کالج ان پناہ گیروں کے لیے کھلوا دیں۔ اور ہر بنس اگر ہو سکے تو پندرہ

بیں عارضی لیٹرن کا انتظام کروادیں۔ پندرہ۔ بیس صفائی والے بھی ہونے چاہئیں۔ گڈھے کھود کے چاہے گندگی دبادیں، نہیں تو وہاں پر ہیضہ پھیل جائے گا۔ اور ہربنس آپ وہاں پر ایمبولینس بھیجواسکتے ہیں؟ کچھ زخمی پڑے ہیں۔ کھلے ہوئے زخموں سمیت، مٹی میں ہی۔ انھیں تو گینگیرین ہوجائے گا۔ زخموں میں سپٹک ہوجائے گا۔"

پتہ نہیں ہربنس کی کوشش سے یا خوشونت کے رسوخ سے، تیسرے دن شیام لال کالج کے کمرے کھول دیے گئے۔ عارضی پائخانے بھی بن گئے چھولداریوں میں۔ پندرہ بیس صفائی والے بھی آگئے۔

زخمیوں کے علاج کے لیے ہربنس نے صرف ایمبولینس ہی نہیں بھیجی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بھی بھیج دی۔

کچھ آرٹسٹوں نے، سوشل ورکروں نے، تھیٹر کے لوگوں نے جھٹ پٹ ایک گروپ بنایا۔ سب ہی لوگ اراجیت بھون میں صبح صبح جمع ہوتے۔ کپڑے، کھانے پینے کا سامان۔ جوتے، کمبل اور رضائیاں، سب وہاں اکٹھا کرلی جاتیں اور پھر گاڑیوں میں بھر کر الگ الگ کیمپوں میں بھیج دی جاتیں۔

میں اور ارپنا بھی اس گروپ میں جاملے، کیونکہ اس کے وسیلہ سے خدمت اور مدد کا تمام کام منظم طریقہ سے کیا جاسکتا تھا۔

یہاں جذباتی لوگ نہیں تھے۔ صرف انسانیت اور انسانی ہمدردی کے لیے کام کرنے والے لوگ تھے۔ یہاں میری طرح کوئی ہچکیاں لے لے کرنہیں روتا تھا۔ کیونکہ یہ سب ہی ایک جنگی محاذ پر تعینات سپاہی تھے۔ خود ہی گھبرا کر۔ خاندان چھوڑ کر، درندگی اور ہمسائگی کے درمیان ہورہی اس جنگ میں انسانیت کے تحفظ کے لیے آکر تعینات ہوئے تھے۔

شیام لال کالج کے دروازے کھل گئے۔ کمروں کے تالے بھی کھول دیے گئے۔ لیکن کوئی بھی پاس کے کالج میں گاندھی میموریل اسکول سے نکل کر جانے کو آمادہ نہ ہوا کیونکہ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی تھی اور کالج کے اندر جانے کے لیے پہلے اس اسکول کے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پار جانا پڑتا تھا اور سڑک پر نکلنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سڑک پر نکلنے کا مطلب تھا موت، موت کی سلطنت میں جا کھڑے ہونا سڑک پر نکلنے کا مطلب تھا، اپنے آپ کو خونی ہجوموں کے حوالے کردینا۔ سڑک پر نکلنے کا مطلب تھا خطرے کے دائرہ

میں جا کھڑے ہونا۔

کس طرح کے دن تھے یہ جب لوگ سڑک پر نکلتے ہوئے بھی خوف زدہ تھے۔

سو میں نے کہا۔ ایسا کرتے ہیں، گاندھی میموریل اسکول کے عقبی میدان کی دیوار و درمیان میں سے گرا کر راستہ بنا لیتے ہیں۔ اور دوسری طرف شیام لال کالج کی بھی پچھلی دیوار کا ذرا سا حصہ منہدم کر دیتے ہیں۔''

''لیکن پولیس والے؟''

دو پولیسئے گاندھی میموریل اسکول کے پچھلے میدان میں ایک درخت کے نیچے بنے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ انھیں میں نے ایک طرف لے جا کر کہا'' یہ کام تو کرنا ہی ہے۔ بتاؤ تمھاری فیس کیا ہوگی؟''

وہ ذرا سے جھجکے۔ زیادہ نہیں بس اتنی دیر کہ دو چار منٹ چپ رہے ہو اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ہو۔ ''اگر ان اسکول والوں اور کالج والوں نے اعتراض کیا؟''

''ان کی تم فکر مت کرو۔ دونوں دیواروں کی مرمت کا ذمہ میرا ہے۔''

فیس دے دی گئی۔ وہ کہنے لگے۔ ''اگر مرمت نہ کروائی؟''

اب میں نے انھیں اپنا پریس کارڈ نکال کر دکھا دیا اور دونوں کو ایک ایک وزیٹنگ کارڈ بھی دے دیا۔

''ایک مہربانی یہ کرو کہ باہر گیٹ پر جو پولیس کا ٹرک کھڑا ہے اسے گلی کے سرے پر کھڑا کر دو۔ عمارتوں کے دونوں گیٹ بند کر دیتے ہیں۔ باہر سے اگر کوئی حملہ آور آئے تو ایک ہی راستہ رہے، گلی کا۔ اس کے باہر تم کھڑے رہو گے۔ کوئی خطرہ نہیں۔''

مجھے معلوم تھا ان دنوں سب سے زیادہ خطرہ پولیس سے ہی تھا۔ خون کے پیاسے ہر ہجوم کے ساتھ پولیس کی محافظ ٹکڑی چلتی تھی۔ پولیس کی جیپ میں ہی پیٹرول اور مٹی کے تیل کے وہ کنستر لاد کر بستیوں میں پہنچے تھے۔ جن سے زندہ انسان جلائے گئے تھے۔ جن سے گھر جلا کر کھنڈر بنا دیے گئے تھے۔ عصمت دری کرنے والوں میں بھی پولیس والے خود شامل تھے۔

بلکہ کئی جگہ تو پولیس نے پہلے پوری بستی سے اسلحہ اکٹھا کر لیے تھے۔ تلواریں اور لاٹھیاں، ایک آدھ ریوالور اور بندوق بھی۔ یہ کہہ کر کہ یہ سب امن برقرار رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اور جب لوگ نہتے ہو گئے تب مشتعل چیختے لوگوں کے ہجوم خود پولیس کی نگرانی میں آئے۔ قتل و غارت کے چنگیزی اور تیموری حملے ان کی ہی نگرانی میں ہوئے۔ ان کی ہی مہربانی کی وجہ سے۔ ویسے مہربانی

بھی کا ہے کی۔ وہ کہتے تھے۔حکم ہی ایسے آئے تھے اور پھر ہر مہربانی کا عوض تو اس ملک میں مل ہی جاتا ہے۔ سپاہی سے لے کر وزیر تک اور چپراسی سے وزیر اعظم تک ہر کوئی غرض مندوں پر ہر لمحہ مہربانیاں کیے جا رہا ہے۔ مہربانیوں کے 'شکرانے' وصول کیے جا رہے ہیں۔

چنگیزی، تیموری اور نادر شاہی حملے سے یہ حملے صرف اس قدر الگ تھے کہ وہ لوگ سلطنت فتح کرنے کے لیے زمین پر اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے کے لیے۔ کامیابی کا تاج پہننے کے لیے۔ بہت سارے ملکوں کی بادشاہت حاصل کرنے کے لیے مارا ماری کرنے آئے تھے۔ خون کے دریا بہاتے۔ پار کرتے۔ لیکن یہ حملے صرف درندگی اور وحشی پن کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

مجھے لگ رہا تھا کہ یہ حملے یہ قتل میرے ذہن میں نازیوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ نازی بھی اسی طرح منظم طریقوں سے ناموں کی لسٹ بنا کر یہودیوں کو تلاش کرتے تھے۔ وہ نازی شاید خود ایسے وحشی نہیں تھے جو ان چھپے ہوئے چوہوں کی طرح سہمے ہوئے۔ اُن عورتوں، بچوں، مردوں، بزرگوں کو کھوج کر، چھانٹ چھانٹ کر اس حساب سے کہ کون لوگ کڑی محنت کرنے لائق ہیں اور کون نہیں، انھیں مشقت کیمپوں میں گیس چیمبروں میں بھیج دیتے تھے۔ ماں کہیں؛ اور بچے کہیں، اور مرد کہیں اور بزرگ کہیں۔ وحشی تھا وہ ہٹلر جس نے اوپر سے حکم جاری کیا تھا۔ نیچے والے تو صرف حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ کچھ زیادہ ظالمانہ طریقہ سے اور کچھ کم وحشی طریقہ سے۔ ساٹھ لاکھ یہودی قتل ہوئے تھے۔

آج جب نومبر کے ان سیاہ اور خون سے تر سرخ دنوں کی داستان لکھ رہی ہوں، بوسنیا اور سرائیو میں لاکھوں بے قصور بھیونڈی، ملیانہ اور ممبئی کے خون آلود اوراق میرے چاروں طرف پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اوراق جن سے تاریخ ہمیشہ شرمندہ رہے گی۔ پنجاب، کشمیر، بہار اور آسام، ہر جگہ پر خون آشام بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اور ناگاساکی اور ہیروشیما آج بھی ہماری یادوں میں خوف کے رونگٹے کھڑے کرتے رہتے ہیں۔

انسان۔ اشرف المخلوقات جس کے اندر آج بھی آدم خور درندے چنگھاڑتے رہتے ہیں۔

خیر، اسکول اور کالج کے عقبی کمپاؤنڈ کی دیواروں کو درمیان سے توڑ کر آر پار گزرنے کے لیے راہ بنا دی گئی۔ لوگوں کو ذرا سانس لینے کی جگہ ملی۔ ویسے ابھی بھی ایک ایک کمرے میں پندرہ پندرہ، بیس بیس خاندان سمٹ کر بیٹھے تھے، برآمدے میں بھی لوگ نڈھال سے اپنی اپنی

جگہ بیٹھے تھے، اور باہر کھلے آنگن میں بھی۔

وہاں مہینہ بھر تک ہم دونوں — میں اور ارپنا۔ صبح سے نصف شب تک رہتے تھے۔ جو بھی اس طرح کے حالات میں ہوسکتا تھا کرتے تھے۔

ساتویں دن، مدر ٹریسا مشن کی عورتیں بھی بچوں کے لیے خشک دودھ کے ڈبے اور بسکٹ لے کر آ پہنچی۔ سارا سارا دن وہ دودھ گھولتیں اور بچوں کو مگوں میں ڈال ڈال کر پلاتیں۔ بیماروں کی خدمت کرتیں۔

دسویں دن ایک اور جھولداری لگی اور اس میں ایک موٹا۔ پستہ قد خوفناک سا نظر آنے والا سرکاری ملازم آ بیٹھا۔ اس کی حفاظت کے لیے پانچ سات سیکورٹی فورس کے جوان بندوقیں لے کر اس کو حصار میں لیے رہے۔

سب سے پہلے اس نے آ کر اسٹور کو تالا لگا دیا۔ وہ اسٹور جس میں ہم لوگوں نے اپنی رقم صرف کر کے، اپنے دوستوں، ساتھیوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں سے رقم اور سامان جمع کر کے رضائیاں اور کمبل اور خورد ونوش کا سامان اور دوائیاں خرید کر رکھی تھیں۔

رات نو بجے ہم کو اس بات کا پتہ چلا۔ یہی وقت تھا جب ہم گھوم گھوم کر دیکھتے تھے کہ کس کے پاس رضائی یا کمبل نہیں۔ یا کس کے بچے ادھ ننگے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی حساب سے رات کے وقت کمبل اور رضائیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ سب کا حساب رکھا جاتا تھا۔ پہلے لسٹ بنائی جاتی، پھر اسٹور میں سے اتنے کمبل اور رضائیاں نکال کر تقسیم کر دیے جاتے۔ الگ الگ ورکروں کو علیحدہ علیحدہ ونگ سونپے ہوئے تھے۔ وہی اپنے اپنے ونگ میں رہنے والے پناہ گزینوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے ذمہ دار تھے۔

لسٹ بنا کر جب ہم لوگ اسٹور کی طرف بڑھے تو دیکھا باہر دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ پاس ایک بندوق لیے سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔

''یہ تالا کس نے لگایا ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

صاحب نے: کون صاحب؟

''آج سے ڈیوٹی پر آئے ہیں، نئے صاحب ہیں۔'' سرکاری چمچے نے دوسری طرف دیکھ کر لاپرواہی سے جواب دیا۔

''وہ ہیں کہاں؟''

''ان کے دفتر سے پتہ کرو۔''

''دفتر کہاں ہے؟''

''وہ سامنے تمبو میں۔''

تمبو میں دو تین اور بندوق والے کرسیوں پر ٹانگے پسارے بیٹھے تھے جیسے بارات میں آئے ہوں۔

''صاحب کہاں ہیں؟''

''یہیں کہیں ہوں گے۔'' انھوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔'' بابا معاف کرو۔''

''یہاں کہاں؟'' اب میں نے تلخ اور دم دار آواز میں پوچھا۔ کیونکہ میرے ساتھ دو تین لوگ اور بھی وہاں آ پہنچے تھے۔ ایک فنکار، میری بیٹی ایک تھیسز کا آدمی۔ انھوں نے مجھے آہستہ سے کہا۔'' ذرا سنبھل کے۔ ان الو کے پٹھوں کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ ہم سب کو باہر بھی نکال سکتے ہیں۔ جو لوگ انسانوں کو مروا سکتے ہیں۔ سامنے کھڑے ہو کر وہ کچھ بھی کروا سکتے ہیں۔''

''مار ہی دیں گے نا۔ جہاں اتنے ہزاروں لوگ مارے گئے، کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں غصہ میں تھی۔

''بھئی بتاؤ بھی، یہاں کہاں؟''

'کیمپ میں تو ہیں نہیں۔ ہم ابھی کونے کونے کا چکر لگا کر آئے ہیں۔''

''پھر کھانا کھانے گئے ہوں گے۔ کھانے کا وقت ہے۔ سب کو روٹی بھی تو کھانا ہے نا۔'' وہ بھی جھنجھلا پڑے۔

ہم دو گھنٹے تک صاحب کے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ واپس پہنچے تو پان چبا رہے تھے۔ منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

''آپ ہی ہیں انچارج؟ نئے انچارج؟''

''ہاں میں ہی ہوں۔'' وہ اکڑے۔

''اور گیارہ بجے تک آپ کہاں غائب تھے؟''

''آئی ایم ناٹ آنسر ایبل ٹو یو۔''

''اونو۔ یو آر ناٹ آنسر ایبل ٹو اینی ون آپ تو سرکار ہیں۔ سرکار تو......''

کام بتاؤ کیا ہے؟'' وہ گرجے۔

''آپ نے اسٹور پر تالا کیوں لگوایا؟''

''کیوں نہ لگاؤں؟ میں اس کیمپ کا انچارج ہوں۔''

''وہ تو ظاہر ہے۔ اتنا پہرہ لگا ہے۔ آپ کی اکیلی جان کی خاطر۔ ضرور بڑے خاص افسر ہوں گے۔ لیکن کیمپ کا چارج لینے کے بعد آپ نے کیمپ کے کس کونے کا معائنہ کیا ہے؟ کس کا کیا کام کروایا ہے؟ کوئی شکایت کوئی رپورٹ آپ نے کس کی درج کی ہے؟ کسی کے گمشدہ خاندان کو تلاش کرنے کے لیے آپ نے کسی آدمی کو تعینات کیا ہے؟ کچھ نہیں صرف ایک کار گزاری کی ہے کہ ہمارے ہی اسٹور کو تالا لگا دیا ہے۔ اور خود دو گھنٹے بعد کھا پی کر پان چباتے آگئے ہیں۔''

''سرکاری افسر کی توہین کے لیے میں تجھے اریسٹ کر سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں؟ اریسٹ بھی کر سکتے ہیں اور تھانے کے اندر یا باہر کہیں بھی لیکیوڈیٹ بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی طاقت کا پورا احساس ہے۔ پر جو کرنا ہے کرتے رہنا۔ پہلے تالا کھولو۔''

''تالا تو نہیں کھلے گا۔''

''تالا تو ضرور کھلے گا۔'' اور ابھی کھلے گا۔'' اب میں نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ یعنی ''پریس کارڈ۔''

''یہ میرا نام پتہ نوٹ کر لو۔ جب مرضی ہو اریسٹ کر لینا۔ لیکن پہلے تالا کھولو۔ کیونکہ اس میں سرکاری سوئی بھی نہیں ہے اس میں تمام سامان ہماری محنت سے اور اپنے دس ناخنوں کی کمائی سے خریدی ہوئی ہے۔ رشوت کی کمائی سے نہیں۔''

اسے چوٹ تو ضرور لگی ہوگی۔ خاص کر اپنے ماتحتوں کے سامنے۔ لیکن اس نے تالا کھول دیا۔ بڑبڑاتے ہوئے کہ ٹھیک ہے۔ بعد میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔ لیکن اس بڑبڑاہٹ میں دھمکی نہیں تھی۔ ممیاہٹ تھی۔

اس کیمپ میں دس پندرہ ہزار لوگوں کی دس پندرہ ہزار کہانیاں تھیں اور اسی قدر کہانیاں ترلوک پوری، اتم نگر اور اجڑی ہوئی بستیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ان میں سے میں آج آپ کو صرف تین کہانیاں سناؤں گی۔

ایک کمرے کے ایک کونے میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ اور اس کے آس پاس چار پانچ بچے۔ ہم جس وقت بھی اس کو روٹی کھانے کے لیے لنگر میں چلنے کو کہتے وہ تھکا سا سر ہلا کر نا کر دیتی۔

بچوں کے لیے روٹی دودھ؟

وہی نا۔

ایک دن گزر گیا۔ دو دن گزر گئے۔ تین دن گزر گئے۔

اب وہ بیٹھی ہوئی نہیں تھی۔ نڈھال۔ بے سہارا سی فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کے بچے اس کے پیٹ سے ٹانگوں سے چپٹے ہوئے۔ گھٹنے پیٹ میں موڑ کر گردن سینے میں جھکا کر لیٹے ہوئے تھے۔

''یہ تو نہ خود روٹی کھاتی ہے نہ بچوں کو کچھ کھانے دیتی ہے۔ کیا کریں؟''

پھر ہم نے ہر کمرے میں سے لوگوں کو لا لا کر اس عورت اور اس کے بچوں کو دکھایا۔ کوئی جانتا ہے؟ کیا کوئی اس کے محلے کا رہنے والا ہے؟

آخر ایک آدمی مل گیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بی بی اُٹھ حوصلہ رکھ، صرف تیرے ساتھ تو نہیں ہوئی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوئی ہے۔'' اس عورت نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسے رو لینے دو۔ روئے گی تو اسے اپنے بچے نظر آئیں گے۔ روئے گی تو ان معصوموں کو اسے روٹی کھلانے کی یاد آئے گی۔''

پھر اُس آدمی نے ہمیں بتایا۔'' دو نومبر کی رات کو ان کے محلے پر حملہ ہوا تھا۔ اس کے گھر والے کو تو گلی میں گھسیٹ کر باہر لے آئے اور سر پے مار مار کر اسے گرا لیا اور پیٹرول ڈال کر آگ لگا دی۔ اس کا بڑا بیٹا اندر ہی کسی ٹرنک کے پیچھے چھپا رہا۔ یہ بچوں کو لے کر باہر دوڑی۔ پڑوسیوں نے جھپٹ کر اسے اپنے دروازے کے اندر کھینچ لیا۔ بچوں کو بھی چھپا لیا۔

''بعد میں اس ہجوم نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔''

''یہ بار بار باہر نکلنے کی کوشش کرتی۔'' میرا سوہن کہاں ہے؟'' اسے لے آؤں۔ مار دیں گے وہ اس کو۔''

''سوہن تو جلتے گھر کی لپٹوں میں گھر گیا تھا۔''

''جب ہجوم چنگھاڑتا اپنی جیت کی خوشی میں پاگل سا اس محلے سے نکل گیا تو پڑوسی ہم سب کو اسے اور اس کے بچوں کو یہاں کیمپ میں لے آئے۔''

''یہ آدھی رات کو یہاں سے نکلی اور اپنے جلے ہوئے مکان میں جا پہنچی۔ اپنے بیٹے سوہن کو تلاش کرنے۔''

''کھنڈر بن گئے مکان میں سے ابھی دھواں نکل رہا تھا۔''

''اندر آنگن میں سوہن کی ادھ جلی لاش پڑی تھی۔''

''اس نے سوچا ادھ جلی لاش تو کتے نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ سو یہ روتی بلکتی تمام رات اپنے گھر کے باقی ماندہ کواڑ، چوکھٹیں اکھاڑتی رہی اور لاش کو جلانے کی کوشش کرتی رہی۔''

''اس بات کا ہمیں پتہ تب چلا جب ہمارے پڑوسی ہم سے ملنے یہاں آئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ان کے گھر سے مٹی کا تیل اور ماچس مانگنے گئی تھی۔''

تمام رات جو عورت اپنے جوان بیٹے کی لاش جلانے کے لیے گھر کے دروازے اور چوکھٹے اکھاڑتی رہی ہر اس کے ساتھ جو نہ ہو کم ہے۔ ہے واہ گورو رحم کر۔'' اس آدمی نے ایک گہری سانس لی اور بچوں کو لے کر لنگر کی طرف چل پڑا۔

وہ عورت دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔

ہم نے اسے پانی لا کر دیا۔ اس نے پی لیا۔

ہم نے اس کے آگے روٹی لا کر رکھی۔ لرزیدہ ہاتھوں سے اس نے ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔

برآمدے میں ایک نورانی سے چہرے والے۔ رعب دار باوقار سردار اور اس کا خاندان تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت۔ سنجیدہ۔ اور گدرائے جسم والی۔ گول چہرے والی اس کی سردارنی تھی۔ اور ایک جوان بیٹا۔ جس کے بال گھاس کی طرح کٹے ہوئے تھے۔

سردارنی کہنے لگی۔ ''فیکٹری جلا دی، گھر لوٹ لیا۔ اور جلا ڈالا ان ظالموں نے ہمسایوں نے ہمیں چھپا رکھا تھا۔ پھر وہ جب ہمیں کیمپ میں پہچانے لگے۔ انھوں نے درخواست کی۔ ''بی بی جی لڑکے کی جان بچاؤ اس کے کیش کاٹ دو۔ سو میں نے انھیں نگوڑے ہاتھوں سے اس کے کیش کاٹے۔'' اور وہ رونے لگی دوپٹہ کے کونے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہنے لگی۔ گھر،

فیکٹریوں کا کیا ہے جی وہ تو گرو نے ہی بخشی تھیں۔ اپنی امانت خود ہی واپس لے لی۔ پھر کیا ہوا۔ اسے ہی فکر ہے۔ خود روزی روٹی کا انتظام کرے گا۔ پھر دے گا۔ لیکن کاٹے کے کیش۔ ہائے دہی ڈال ڈال کر دھوتی تھی۔ میں انھیں، اتنے سندر اتنے گھنے، اتنے نرم بھورے بھورے کیش۔''

ایک بہت ہی بزرگ سردار جی برآمدے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ گزشتہ پانچ سات دنوں سے ایک ہی جگہ سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ کبھی دیوار کے ساتھ پیچھے سر لگ جاتا۔ تو اونگھتے سے نظر آتے تھے۔ اس کا منہ بچوں کی طرح ذرا سا کھلا رہتا۔ داڑھی میں میلے سے، پیلے سے سفید سے بال کانپ رہے ہوتے ان کی بھوؤں کے بال بھی سفید تھے۔

گلے میں میلا سا کرتا پائجامہ۔ سر ننگا۔

بات کرنے کی بہت کوشش کی۔ وہ خاموش سر جھکائے بیٹھے رہتے۔

کسی کسی وقت ان کی سانس کے ساتھ بہت آہستہ آواز میں واہے گرو سنائی دیتا۔

آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بیٹے آٹو رکشا چلاتے تھے۔ دو دنوں سے گھر ہی نہیں پہنچے تھے۔

جب ان کی بستی پر حملہ ہوا تو یہ چھپتے چھپاتے اپنی دونوں بہوؤں اور ان کے بچوں کے ساتھ اس کیمپ میں آ پہنچے۔

پھر دو دنوں کے بعد ان کی بہوئیں چلی گئیں۔ یہ کہہ کر کہ وہ اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنے جا رہی ہیں۔

''اور بچے؟''

پتہ نہیں انھیں ساتھ لے گئی ہیں یا انھی کسی کو سونپ گئی ہیں۔ اتنی بڑی بھیڑ میں کہاں ڈھونڈوں۔'' ان کا گلا بھر آیا۔

اس وقت مجھے خیال آیا اگر دار جی یعنی میرے والد آج زندہ ہوتے تو شاید اسی طرح اسی کونے میں بیٹھے ہوتے۔ اسی طرح ان کی سفید داڑھی کانپ رہی ہوتی۔ شکر ہے وہ یہ تمام قیامت دیکھنے سے پہلے چلے گئے۔

بابو جی۔ میں نے آہستہ سے انھیں چھوا۔ ''آپ یہ کمبل لے لیں ٹھنڈ ہے۔''

''نہیں جی آپ کمبل کسی ضرورت مند کو دے دیں۔''

"لیکن اگر آپ کو ٹھنڈ لگ گئی؟ بخار چڑھ گیا؟"

"اچھا ہے جی۔ اور یہاں اب کیا دیکھنا باقی رہ گیا ہے۔"

خیر دھیرے سے وہ کمبل ان کے گھٹنوں پر ڈال آئی۔

اگلے دن وہ کمبل اسی طرح تہہ کیا ہوا پڑا تھا اور وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

بڑی کوشش کی، لیکن نہ تو وہ کوئی کپڑا لینے کو تیار ہوئے نہ سوئیٹر نہ کمبل۔ نہ رضائی۔

ساتواں یا آٹھواں دن تھا۔ میں ان کے لیے سفید پگڑی لے کر گئی۔ ایک منٹ تک وہ پگڑی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں ان نظروں میں کیا تھا کہ وہ گرم سلاخوں کی طرح میرے سینے میں اتر گئیں ابھی بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں وہ نگاہیں جیسے میرا کلیجہ کاٹتی ہوں۔

کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے پگڑی پکڑ لی۔ تہہ کھولی۔ اس کی چوڑائی کو ہتھیلی میں اکٹھا کیا اور کانپتے ہاتھوں سے سر پر لپیٹنے لگے۔ ایک کے بعد ایک لپیٹ۔

پگڑی باندھ کر انھوں نے جب میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سے دو میلے سے آنسو ان کی گالوں کی جھریوں میں دھاریاں بناتے ہوئے داڑھی کے بالوں میں چھپ گئے تھے۔

OO

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

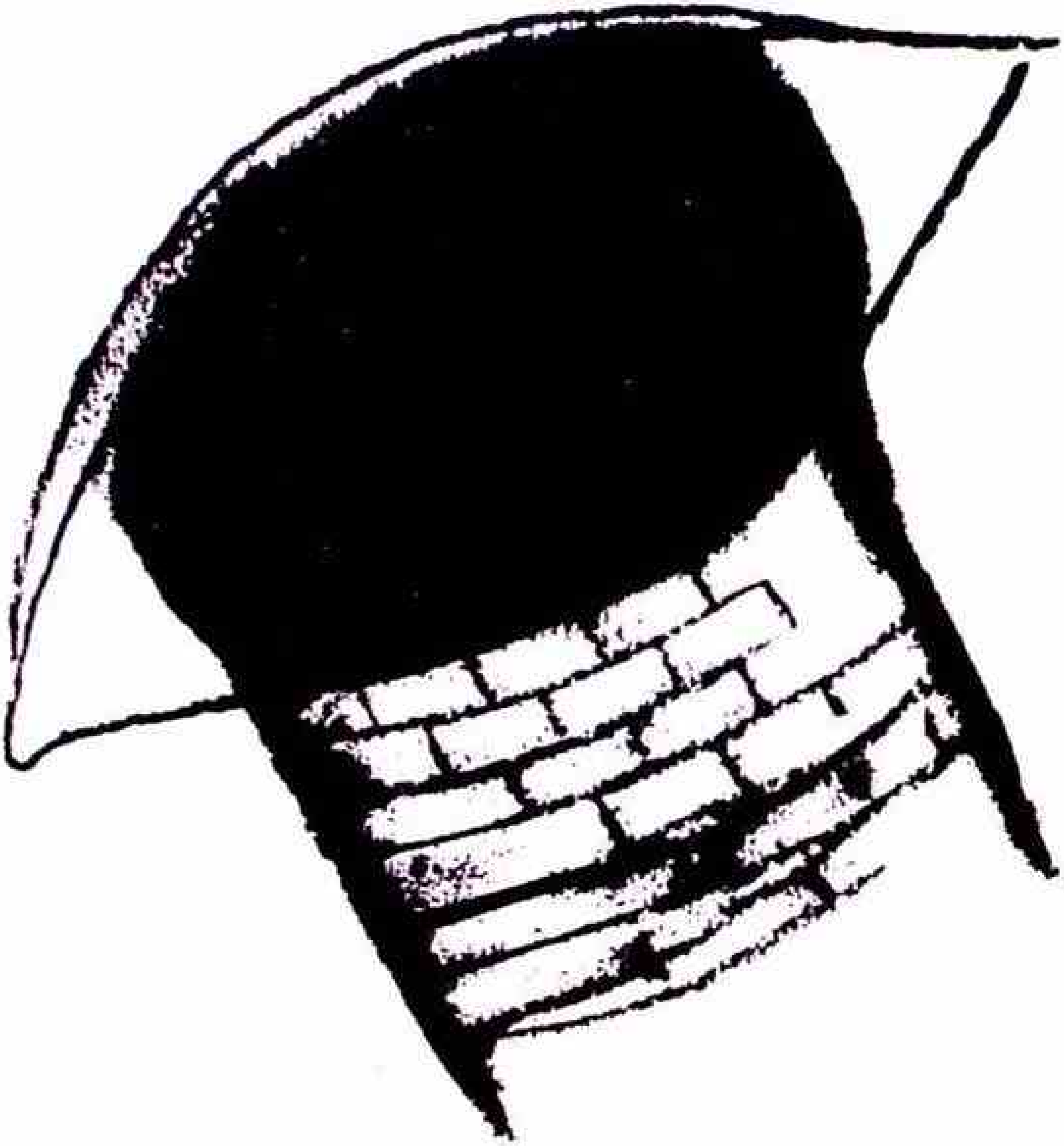

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲